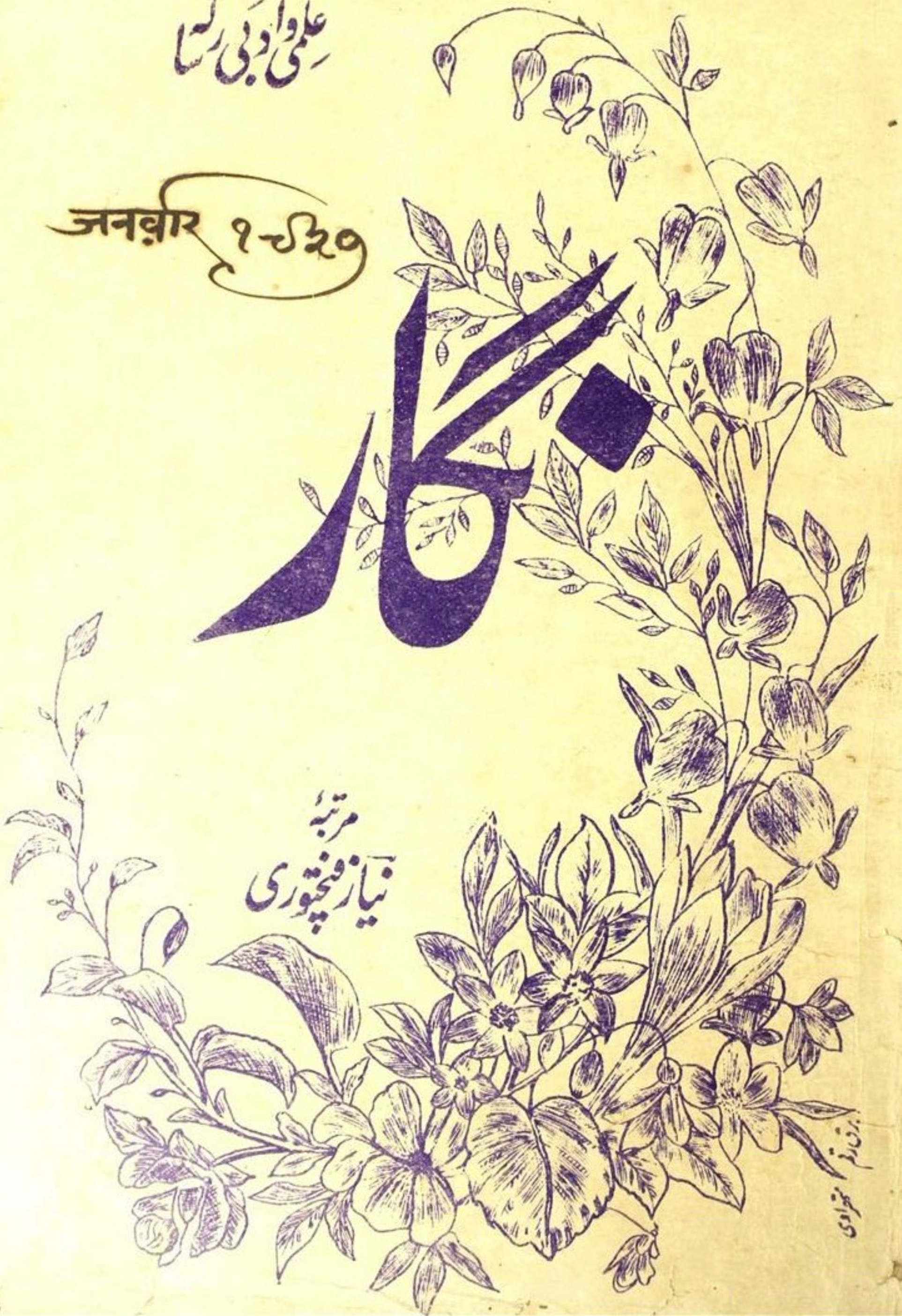


علی دینی رستا

۱۰۲۹ جنوری

کتاب

مرتبہ
نیاز پختوری



برق رزم
مختاروی

قواعد رسالہ نگار

- ۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔
- ۲ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں مئی تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے، ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا۔
- ۳ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہیں۔
- ۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ارکائٹس کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
- ۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔

(نگار)

۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، شش ماہی تین روپیہ۔

تصویر قاصد

بنگال کے مشہور مصور فریدار کے قلم کی بہترین صناعتی۔ یہ تصویر بھی رنگین آرٹ میسر پر طبع کرائی گئی ہے اور یہ تصویر رسالہ نگار ماہ مارچ میں شائع ہو چکی ہے آپ دیکھیں گے تو بہت خوش ہونگے قیمت فی کاپی صرف ۴ روپیہ

تصنیفات مولانا نیاز فتح پوری

صحابیات

یعنی عہد سعادت کی اٹھاون خواتین کے نہایت صحیح اور مستند حالات۔ خواتین کے مطالعہ کے لئے ضروری چیز قیمت ۴ روپیہ

تصویر زیب النساء بیگم

یہ تصویر صنعت نقاشی کا ایک درمیانہ نمونہ ہے۔ رنگین آرٹ میسر پر تیار کرائی گئی ہے یہ بھی تصویر ہے جس کو حکومت نے نہایت گراں قیمت پر خرید کر کے برٹش میوزیم کو دیا ہے۔ نہایت نفیس چیز ہے قیمت علاوہ محصول ۴ روپیہ

گوارہ تمدن

اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ تہذیب و شائستگی کی ترقی کس قدر عورت کی محنت اور مدد سے ہو سکتی ہے۔ اس کی کئی مثالیں دی گئی ہیں۔

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جو تحلیل نفسی کے اصول پر لکھا گیا ہے اور اپنی بلند تحلیل اور ذہرت بیان کے لحاظ سے بیحد قابل ہے۔ ۴ روپیہ

نگارستان

حضرت نیاز کے تمام بہترین ادبی مضامین کا مجموعہ ادب لطیف کا اگر صحیح لطف اٹھانا ہو تو ضرور منگائیے قیمت ۴ روپیہ

تاریخ الدولتین

علامہ جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلامی کے پانچویں حصہ کا ترجمہ جس میں دولت نبی عباس بنی امیہ پر مشتمل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ۴ روپیہ

نرخامہ اجرت اشتہارات

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخامہ اجرت اشتہارات	تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ	(۱) اجرت اشتہار ہر حال میں پیشگی آنا لازمی ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینے ان کو ۲۰ فی صدی کمیشن دیا جائیگا	تین مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۷ روپیہ	۵ روپیہ	(۳) میعاد اشتہار کے اندر ۲ مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	ایک مرتبہ	۵۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۱۲ روپیہ

نگار

ایڈیٹر نیاز فنیوی

۱۱ سال پہلے گیارہ سال سے اس شخصیت فرمانروا

جلد (۱۱)

شمار (۱۱)

ملاحظات

نگار کا پانچواں سال بھی عافیت سے گزر گیا اور اگر محض بقا بجائے خود کوئی امر باعث مسرت ہو سکتا ہے تو مجھے اعتراف کرنا چاہیے اُن حضرات کے لطف و کرم کا جن کی اُمت
 لو اگر میں چاہوں تو شاعرانہ لہجہ میں مسیحا نفسی سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے سب سے پہلے اعلیٰ حضرت حضور پر نور فرمانروا دارالہدٰی رامپور
 کے بارگاہ ہمایوں میں اپنا عاجزانہ تشکر پیش کرنا چاہیے کہ حضور مدوح کی نکتہ رس و علم دوست فطرت نے نگار کی خدمات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ کر اس کو حاضری کا
 شرف بخشا اور شاہانہ امداد فرمائی ہے

اے جو دے تو دست و دل سخارا

وے عزم تو بال و پر صبارا

ہندوستان کے موجودہ مسلمان فرمانرواؤں میں حضور مدوح اپنی مشرقی خصوصیات کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور جن کو کبھی حاضری کا موقع ملا ہے
 وہ واقف ہیں کہ ذات اقدس کدر و جہ عزت و احترام کی مستحق ہے۔ جس وقت تک مجھے شرف باریابی حاصل نہ ہوا تھا، میں اعلیٰ حضرت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا
 تھا، لیکن جب خوش بختی سے یہ زینِ فرصت عطا ہوئی اور عزت ہم کلامی میسر آئی تو سب سے پہلے حقیقی معنی میں مجھے اسی وقت علم ہوا کہ ذات گرامی کن غیر معمولی انسانی صفات
 سے متصف ہے۔ اعلیٰ حضرت کا تجر علمی، قوت ملاحظہ، جامعیت فنون، صحت فکر، اصابت رائے اور حسن تدبیر ایک ہی وقت میں ان سب کا نہایت گہرا اثر منجھ پر پڑا اور میں
 لگا کر ایک تہی کے اندر یہ تمام خصوصیات کیونکر لکھا ہو گئیں پس یہ ہے لیس عذابِ بدستگیر

نگار

بھوپال سے ہر ماہ کی پندرہ کو شائع ہوتا ہے چند سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین جنوری ۱۹۲۷ء

تصادیر - ماہ نو اور بلبل اسیر

ملاحظات	۲	ہمیشہ مرحومہ (تظم)	حضرت اصغر لودھیانوی	۶۷
شمالی ہند اور دکن	۵	شہید جتو (تظم)	ادوارح میں سراج	۶۸
آغاز ہستی (ڈراما)	۱۷	اہل دہلی اور اہل لکھنؤ	امین حزیں	۶۹
اوزنگ آباد اور اسکالواج	۲۹	میر قافلہ کی صدا (تظم)	جناب عالی رنغی	۷۰
حالی اور نثر اردو	۳۷	غزلیات	سید محمود اسلمی	۷۱
ایلی مجنوں (تظم فارسی)	۵۲	مولانا فاروق چریا کوٹی مرحوم	الکیر حیدری، دل شاہ جاپوری، ندیم، گوثر	۷۲
غزل	۵۵	حضرت درد کا کوردی	یوسف - ہادی - کیف	۷۳
خواب (افسانہ)	۵۶	آسمانی سوار (فانہ)	سید حامد حسن قادری	۷۴
ظہیر الدین محمد بابر	۶۰	استفسارات	کتاب موصولہ و معلومات	۷۵
				۷۶-۹۴-۹۵

اس کے بعد مجھے عالی جناب نواب اہدہ کیپٹن محمد سعید لطف خاں بہادر اور ان کے برادر اصغر نواب اہدہ کیپٹن محمد رشید لطف خاں بہادر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنکی سہر دیاں محل کرنے کا فخر نگار کو شروع ہی سے حاصل ہے اور جن کی امداد سے وہ ہمیشہ گرانبار رہیگا۔

بھوپال کی ان دو رفیع القدر ہستیوں کا علم اہل بھوپال کو خواہ کسی طریق سے ہو لیکن مجھ انگلی جن خصوصیات نے کشاں کشاں ان کے آستانہ تک پہنچا دیا، وہ ضرور ان کی بلندی فطرت اور صحت ذوق ہے۔ انسان کے لئے صرف نوجوان ہونا ہی ایک ایسا مسکت عذر آزادی ہے کہ عقل سلیم کو بھی اسکے سامنے سپردالینا پڑتی ہے۔ چہ جائیکہ اس کے ساتھ دولت و ثروت جاہ و امارت بھی شامل ہو جائے۔ قیامت ہے لیکن کیا کو باور کرنا چاہیے اگر میں کہوں (کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ”برسم محنت اندیشاں نمی گویم“) کہ میں نے اس عمر کے امراء میں یہ صلاحیت نفس یہ پاکیزگی اخلاق، یہ متانت و سنجیدگی دیکھی سنی۔ کثیر اسد امثالہا۔

اسی سلسلہ میں مجھے ان تمام احباب کرام و ناظرین نگار کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے جنہوں نے توسیع اشاعت میں حصہ لیا اور نگار کو حاضری کی اجازت دی۔

اس وقت جبکہ میں اپنے جذبات منت پذیری کی داد دیر چاہوں، غالباً یہ امر حیرت انگیز نظر آئے گا کہ میں نے اس سلسلہ میں اس مہتی کا ذکر نہیں کیا جس کے خسرانہ الطاف کی میری ہر جنبش قلم ممنون ہے اور جس کا نام نگار کے ہر لمحہ حیات پر مہر دوام کی طرح ثبت ہے، لیکن میں نے قصداً یہ جرات نہیں کی، کیونکہ

اعلیٰ حضرت قدر قدرت، گردوں کا ب نواب مستطاب حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ فرمانروائے ارا لاقبال بھوپال کی بارگاہ سے جو نسبت مجھے حاصل ہے اس کا اقتضار اس بہت زیادہ بلند ہے کہ میں صرف تنک کو اظہار جذبات کا کافی ذریعہ خیال کروں یہ تو حقیقتاً اس کیفیت سے متعلق ہے جس کو بقول عربی

وزن ان آستان سجده رقصہ درجاہ

اس دنیا سے وابستہ جہاں صرف خاموشی کو ”عدتار“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ شخص جس کی ایک سانس سانس مسلسل گیارہ سال سے اعلیٰ حضرت فرمانروا کے

بھوپال کے جو دو سخا، بذل و عطا کی گرانبار منت ہو، جس کے ریشہ ریشہ میں اس آستانہ کا نمک خون بن کر دوڑ رہا ہو وہ کیا خاک مرع سرئی کر سکتا ہے اور کہاں سے اس کو ایسے الفاظ میر آسکتے ہیں جن سے وہ اپنی قلبی کیفیت کا اظہار کر سکے، اس لئے اگر میں نے اس ”قبلہ امن و امان“ کعبہ جان ایمان کے ذکر سے احتراز کیا تو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں نے اس فرض سے آگاہ نہیں ہوں بلکہ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہر جا کہیں سجدہ بردار آستان رسد۔

اور دوسرا یہ کہ میں اس فرض سے کسی طرح عہدہ بر نہیں سکتا۔

در حضورت اردعا گویم چہ سود گونی از تزویر دستاں میز نم

ساکنم این نغمہ را در نیم شب ہمرہ مرغ سحر خواں میز نم

جی چاہتا تھا کہ اس ماہ کے رسالہ میں اپنی گزشتہ پانچ سال کی خدمات کا احتساب کرتا اور ناظرین کرام سے پوچھتا کہ وہ انھیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس باب میں خوب وزشت، حسن قیج کا معیار میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ

گرم تو بندہ شمر دی ز خواجگی صد شکر و اگر قبول نہ کردی ز نا کسی فریاد

لیکن اس خیال سے کہ کہیں یہ سہی طبع نازک پر گراں نہ ہو، خاموشی اختیار کرتا ہوں اور بغیر اس خیال کے کہ ماضی کیا تھا مستقبل کی طرف قدم اٹھاتا ہوں خدا کرے میری یہ مساعی مشکور ہوں۔

سخن طرازی و دانش بہتر نظیری نیست

قبول دوست مگر نالہ حسرتیں گردد

اس مہینے کے مضامین میں جناب سعیدی بی۔ اے کا مضمون شمالی ہند اور دکن جو آئندہ مہینے میں ختم ہو گا فاضل مضمون نگار کی مورخانہ کاوش پر شاہد ہے۔ حضرت مجنوں کا آغاز مہستی براڈ شاہ جس کو اس سال ادبیات میں نوبل پرائز ملا ہے، کے ڈرامہ کا ترجمہ ہو گا۔ براڈ شاہ کی شہرت و عظمت ہر شخص کو معلوم ہے لیکن جناب مجنوں نے بھی جس جن کے ساتھ ترجمہ کیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ یہ بھی آئندہ مہینے میں ختم ہو جائیگا۔ تمکین کاظمی صاحب کا مضمون "اورنگ آباد اور اس کے نواح" پر مفید تاریخی معلومات رکھتا ہے۔ جناب زور بی۔ اے نے "حالی اور شرارِ دو" کے عنوان سے نہایت پاکیزہ ناقدانہ مضمون لکھا ہے، کاش وہ اسی میں حالی کی شاعری کو بھی شامل کر لیتے۔

مضمون "ظہیر الدین بابر" مٹر ہولڈن کی کتاب سلاطین مغلیہ سے ترجمہ کیا گیا ہے، ہولڈن کی یہ کتاب بہت مشہور ہے اور انگریزی زبان کی تاریخی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ مولوی سید عبد السبحان صاحب ناظر کا ملک کو مضمون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر لیا ہے۔ جو نگار میں شایع ہوتا رہیگا۔ مولوی صاحب موصوف نے جس خوبصورتی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے اور ہولڈن نے جس قدر دلچسپ انداز میں یہ کتاب لکھی ہے اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔

خواب، مٹر علی اکبر کاظمی بی۔ اے کا طبع آزمائی کا نام ہے اور خوب ہے "آسمانی سوار" دوم سرفسانہ ہے جسے مولوی سید حامد حسن قادری پھر یونی نے انگریزی سے لیا ہے، جناب عالی رفاعی نے "اہل دہلی اور اہل لکھنؤ" کے عنوان سے بہت کارآمد اور حقیقت سے قریب مضمون تحریر کیا ہے۔ "لیلیٰ مجنوں" مولانا کیفی چریا کوٹی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے اور چونکہ مولانا فاروقی چریا کوٹی ہم سے مجھے بھی شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ اس لئے میں تو اس کو واقعی تبرک سمجھتا ہوں۔ علامہ مرحوم کے علم و فضل کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ نظموں میں جناب اصغر لودھیانوی کی نظم، مرثیہ گوئی میں ایک نئے مگر بلند معیار کی ابتداء ہے جو مجھے پسند ہے شہید جستجو میں امین حزیں نے اپنے اس مقصد کو ظاہر کیا ہے جس کی تبلیغ وہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں اور کامیابی کے ساتھ۔ جناب اسرار علی کی نظم میر تقی قافلہ کی صدا بھی بہت پر لطف ہے غزلوں میں حضرت رزمی کے بعض بعض شعر بہت بلند ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ شعر۔

نگاہ نے جسے چمکا دیا وہ دل میں رہا
جو داغِ دل میں نہ ابھرا وہ آفتاب بنا

حبِ عدہ جناب چغتائی کی دونوں تصویریں اس رسالہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں ان میں سے ایک کا عنوان بلبل اسیر ہے اور دوسری کا ماہ نو چغتائی کا صحیح خیال تو اسی وقت معلوم ہوتا، جب وہ خود ہی اس کی صراحت فرماتے لیکن جاں تک میں سمجھ سکا ہوں ماہ نو کی تصویر تو اس منظر کو ظاہر کر رہی ہے جب چاند دیکھ کر عورتیں حد درجہ کیفیتِ عبودیت کے ساتھ بات اٹھا کر دعا مانگتی ہیں، اور بلبل اسیر میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ بادِ صفت اس کے کہ بلبل ایک بات پر آزادانہ ٹپھی ہوئی ہے، لیکن وہ پھر قفس میں طے کیلئے تیار ہے۔ جس کے پاس اس کی حسین مالکہ نے ایک پھول لٹکا رکھا ہے۔ گویا اس تصویر سے اس تاثر کا اظہار مقصود ہے جس نے میر سے یہ شعر کہلوا لیا تھا۔

نیاز

در پہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر
ہائے کس طرح کی پابندی ہے

شمالی ہند اور دکن

شمالی ہند اور دکن کے تعلقات اور سترہویں صدی کی ابتدا میں دکن کی حالت

یہ امر مسلم ہے کہ "تعارض للبقا" اور خانگی افکارات و نزاعات سے جب انسان کو فرصت ملتی ہے اسی وقت وہ دلجمعی کے ساتھ دوسرے مشاغل میں حصہ لیتا ہے، جب تک ان ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا۔ اُس کی محنت و کوشش وقت اور توجہ اسی میں صرف ہوتی ہے "بقائے حیات" ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو انسان کی تمام تر توجہ اپنی طرف منطقت کر لیتا ہے، اپنی ہمتی کو برقرار رکھنے اور اپنے متعلقین کو آرام و سایش پہنچانے اور اُن کو خوش و خرم رکھنے کی ذمہ داری قدرتی طور پر انسان پر عاید ہوتی ہے اور اسی کا احساس اسے سعی و محنت جانفشانی اور تگ و دو کے لئے آمادہ کرتا ہے، جیسا کہ ضروریات زندگی سے فراغت حاصل نہ ہو جائے وہ دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتا یعنی جب تک ایک گونہ اطمینان حاصل نہ ہو جائے وہ انہماک کے ساتھ اسی کے حصول میں سعی بلیغ کرتا ہے اور یہی اس کا سطح نظر اور یہی اس کا نصب العین ہوتا ہے، جب ان تفکرات سے چھٹکارا ملتا ہے تو پھر اس کی قوتیں ایک دوسری صورت اختیار کرتی ہیں اور جس کی جیسی دماغی ساخت اور ذہنی حالت ہوگی ویسے اُس کے نتائج ظاہر ہوں گے، کوئی تو عیش و نشاط میں مبتلا ہو جاتا ہے، کوئی اہو و لعب میں اپنی عمر گنوا دیتا ہے کوئی اختراع دیا جاد میں اپنی تمام عمر صرف کر دیتا ہے، کوئی کوشاں اور کوشورستانی کو اپنا مقصد قرار دیتا ہے، مسلمان فائقین کی حالت بھی ابتدا میں یہی تھی، خود اپنے وجود کو قائم رکھنے اور بیر دنی سے محفوظ رہنے اور امور مملکت کے انصرام میں سرفروشانہ کوشش کی جب تک مرکزی حکومت مستقل طور پر منظم حالت میں نہ آگئی اور بیر دنی حملوں کا خوف دور اور اندرونی فسادات اور بغاوتیں فرد نہ ہو گئیں انھوں نے دور دراز ممالک کو فتح کر کے سلطنت کو وسیع کرنے کی کوشش نہ کی؛

جغرافی حیثیت سے ہندوستان دو حصوں پر تقسیم رہا، ایک تو شمالی ہند دوسرا جنوبی ہند۔ ہندوستان یعنی شمالی ہند کے مقابلہ میں دکن کا اطلاق زمانہ قدیم سے ہند کے جنوبی حصہ پر ہوا کیا ہے، شمالی ہند زیادہ تر میدانوں پر مشتمل ہے اور جنوبی ہند ایک سطح مرتفع ہے یا یوں کہیے کہ ایک پہاڑی مثلث ہے جس کی دونوں جانب وسیع سمندر لہریں مار رہا ہے؛

شمالی ہند سے سطح مرتفع دکن بالکل علیحدہ رہا ہے لیکن نہ اس قدر کہ وہ تہریا اور ساتھ پھاڑوں کا سلسلہ ہوا سطح دریائے ہند و گنگا سے بالکل خارج ہو جائے اس طرح مرتفع دکن کے درمیانی حصہ کی زبان، نسل، اور اخلاق و عادات شمالی آریوں اور جنوبی ڈراوئیڈوں کی ایک مخلوط شکل ظاہر کرتے ہیں، اگرچہ محل وقوع کے اختلافات بہت ہیں تاہم وہ ہمالیہ سے سمندر تک کے کل ممالک کے جغرافیاتی اتحاد میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتے اور نہ یہ مذہب اور تہذیب کے ارتقاء کے مانع ہیں، جو تمام ممالک کے لئے مشترک ہے، یہ امر واقعہ ہے کہ نسلی و تمدنی اختلاف کے باعث ہمیشہ یہ دونوں حصے جدا رہے، تاہم جنوب پر اقتدار قائم کرنے کے لئے شمال سے جو حملے ہوئے اُن میں ہمیشہ اجزاء اہم قبسی (متمدن نوعی) Homogenetic elements معاون اور اجزاء

غیر جنسی (مختلف النوعی) Heterogenic elements مانگ رہے۔

باد جو اس کے سیاسی اتحاد اس قدر مشکل تھا کہ بڑے بڑے حوصلہ مند حکمران کو صرف اقتدار اعلیٰ پر جو دروازہ مالک میں حاصل ہوا اکتفا کرنا پڑا، جب کبھی شمالی ہند کے حکمرانوں کو فرصت ملی انھوں نے دکن کی طرف توجہ کی اور اس کو اپنی قلمرو میں داخل کیا، اور جب کبھی کمزور بادشاہ کے تخت نشین ہونے یا اندرونی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کے باعث مرکزی حکومت میں کمزوری پیدا ہوئی تو جنوبی ہند خود مختار ہو گیا، بہر حال ہندو مرکز گیر قوتوں کا مقابلہ ہوتا رہا۔

چوتھی اور تیسری صدی قبل مسیح میں موریان خاندان کے راجہ حکومت کو استقلال حاصل ہونیکے بعد دکن پر حملہ آور ہوئے اور دکن کے راجاؤں کو اپنا فرمانبردار اور مطیع بنایا۔ جس سلطنت کی بنیاد چندر گپتا نے ڈالی تھی، رسوک کی وفات کے بعد اس میں انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے۔ شش سو ق م میں پہلا ایشیا سمیترا نے موریان خاندان کے آخری راجہ برہدرا تھا کو قتل کر کے اس کا خاتمہ کر دیا، اور خاندان سنگا کی بنیاد ڈالی۔

ساحل خلیج بنگال اور دریائے گوداوری اور کرشنا کے درمیان ہند کے حصے میں اندھرا قوم آباد تھی، جب بدھ مت کے جلیل القدر شہنشاہ نے دست اجل کو لبیک کہا تو اندھروں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اٹھایا، یہ خاندان اپنے پیشروں کی طرح قوی اور زبردست تھا۔ اب تک ہندوستان کے اعلیٰ حکمران شمالی ہند کے راجہ ہوا کرتے تھے لیکن اس جنوبی حکومت نے ذی اقتدار ہونے کے بعد شمال کو اپنے تسلط میں لا کر اپنا اقتدار قائم کیا، اندھرا خاندان تین سو سال تک برسر حکومت رہا، لیکن ایک قلیل عرصہ کے لئے ایک غیر ملکی قبیلہ ساکیانے ان کی حکومت میں رخنہ ڈالا، بالآخر زوال شروع ہوا، اور شمالی مقصود ممالک زیادہ مدت تک اندھروں کے قبضہ میں نہ رہے، تیسری صدی عیسوی کی ابتدا میں اس خاندان کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ اندھرا خاندان کے آخری راجہ کے مرنے کے بعد راشٹر کوٹ نے اپنی حکومت قائم کر لی اور ان کا ایک خاندان تمام ملک دکن کا مالک بن گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان کی قوت کا خاتمہ چالوکیہ نے کیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں خاندان گپتا کے راجاؤں نے دوبارہ جنوبی ہند کے ایک حصہ قلیل عرصہ کے لئے حکمرانی کی، ساتویں صدی نے شمال کے زبردست راجہ ہر شادورہن اور جنوب کے پال کشن کو جنگ و جدال پر آمادہ دیکھا، لیکن بالآخر دونوں مصالحت پر راضی ہوئے، اور دریائے نرمدہ کو حد فاصل قرار دیا۔

چالوکیہ کے نامور راجہ تالیپا Talipa نے راشٹر کوٹا کو ۳۷۹ء میں حکومت سے معزل کیا، مگر بہت عرصہ تک چالوکیہ اطمینان کے ساتھ حکومت نہ کر سکے، اس لئے کہ ہمارے اشرافیہ میں چولوں کی ایک نئی طاقت ترقی کر رہی تھی، چالوکیہ اور چولا کے درمیان مسلسل جنگ کا آغاز ہوا، تالیپا دوم کے زمانہ میں

۱ History of yenhagir by Beni Pardi d P. 254 .

۲ History of Maratha People by Kincaid & Parsonis P. 8.

۳ Early History of the Deccan by Bhandarkar P. 29

۴ According to Bhandarkar it is A. D. 218.

۵ Early History of the Deccan by Bhandarkar P. 36

۶ History of the Maratha People by Kincaid & Parsonis P. 15.

کارخانہ صنعتی محمد علی تاج علی گڑھ سے جو چیز غلات فراہم پہنچے فوراً واپس کر کے اپنی پوری قیمت یا برے میں دوسری چیز منگالیں۔ محصول آمدورفت ہندوکارخانہ

طلب کیا، اور نظام الدین مخاطب بہ عالم الملک کو دیوگیر کا اور آفدھار کو مالوہ کا حاکم مقرر کیا۔ انہیں کمزور حاکموں کے تقرر کی وجہ سے ایسی عظیم الشان سلطنت کا زوال شروع ہوا۔

اول تو سلطان محمد تغلق کی طرز حکومت سے ناراض تھے اس پر سلطان نے امیران صمدہ سے ناراض ہو کر ان کے قتل کا تھپہ کیا، جس طرح آگے چلکر معلوم ہو گا کہ دکن کی بغاوت کا اصلی سبب یہی امیران صمدہ ثابت ہوئے، بہر حال سلطان نے ملک علی سرجاہ اور ملک احمد لاچین کو عالم الملک سپہ سالار دکن کے پاس بھیج کر یہ فرمان روانہ کیا کہ ایک ہزار پانسو سوار اور مشہور معروف امیران صمدہ کو ان ایلیچوں ہمراہ بہرہ پرچ روانہ کرے، عالم الملک نے راجپوت مدگل۔ گلبرگہ۔ بیجا پور۔ گنچوٹی کے امیران صمدہ کو نہایت کوشش سے دولت آباد میں جمع کر کے سلطان کی خدمت میں روانہ کیا، جب وہ مانگ دون پہنچے تو سلطان کی سیاست سے خائف اور ہراساں ہو کر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان کی طلبی قتل کے واسطے ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ وہاں سے کوچ کر کے واپس چلے جائیں اور علم بغاوت بلند کریں، جب ملک احمد لاچین مانع ہوا تو اس کو قتل کر کے مال و اسباب لوٹ لیا اور دولت آباد کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا، چند روز میں قلعہ پر قبضہ کر لیا اور خزانہ کو آپس میں تقسیم کر لیا، اور باہم مشورہ کر کے اسماعیل مخ کو بادشاہ تسلیم کیا، اور اس کو ناصر الدین شاہ کا خطاب دیکر سر پر چتر لگایا، اور حسن گانگو کو ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز کیا، حسن نے بھیرن رائے حاکم گلبرگہ کو جو سلطان کا ہوا خواہ تھا قتل کر کے گلبرگہ پر مسلط ہوا، غرض دکن جو برسوں کی کوشش کے بعد فتح ہوا تھا تین مہینے کے اندر سلطان کے قبضہ سے نکل گیا، گجرات اور برہودہ کے امیران صمدہ بھی آکر ان کے شریک ہوئے، ان کی قوت بڑھ گئی اور انہوں نے دکن میں فتنہ عظیم مپا کیا۔ جب سلطان کو اس فساد کی خبر بہرہ پرچ میں ملی تو کوچ پر کوچ کرتا ہوا دولت آباد پہنچا، ناصر الدین شاہ بھی مقابلہ کے لئے نکلا سلطان نے اس کو شکست دی اس کے بعد امیران صمدہ نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرنا بہتر ہے۔ چنانچہ اسماعیل مخ دہارگیر میں قلعہ نشین ہو گیا، اور حسب مشورہ باقی امرا اپنی اپنی جاگیروں میں چلے گئے، اور حسن گلبرگہ کی طرف روانہ ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میدان میں سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، لہذا انہوں نے اسی میں مفاد دیکھا کہ فی الحال منتشر ہو جائیں اور جب سلطان دکن سے چلا جائے تو بہرہ دولت آباد میں جمع ہو کر آئندہ کے لئے کوشش کریں جب سلطان عازم شہر قلعہ دہارگیر ہوا تو اسی اثنا میں اس کو خبر ملی کہ حاکم گجرات نے سلطان کے نائب کو قتل کر کے بہرہ پرچ کا محاصرہ کر لیا ہے اس اطلاع کے ملنے پر سلطان خداوند زادہ قوام الدین اور دیگر امرا کو محاصرہ کے لئے نافر دکر کے خود گجرات کی طرف روانہ ہوا۔

سلطان کے جاتے ہی امیران صمدہ کو اچھا موقع ہاتھ آیا، حسن گانگو ایک جرار فوج کے ساتھ بیدر کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں عماد الملک عسکر سلطانی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا، تلنگانہ کے راجہ نے بھی حسن کی مدد کی، قلعہ بیدر کے قریب بہت بھاری لڑائی ہوئی عماد الملک اس جنگ میں مارا گیا، اور سارا لشکر تیر تیر ہو گیا، اس فتح کے بعد حسن، ناصر الدین شاہ کی امداد کے لئے روانہ ہوا، سلطان محمد کی طرف سے جو امرا محاصرہ کئے ہوئے تھے حسن کے خوف سے دہلی اور گجرات بھاگ گئے اور حسن نہایت اطمینان کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، ناصر الدین شاہ نے جب دیکھا کہ زیادہ تر امرا حسن کی طرف رجوع ہیں اور اس کی

۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۰۱

۲ South India & her Mohammedan Invaders P. 45

۳ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۰۳ و تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۱۳۴ و ۱۵۱ و ۱۶۵

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

بہت عورت کرتے ہیں تو اس نے خود ہی سلطنت سے دست کشی کی اور جمیع امیرانِ صمدہ نے ناصر الدین شاہ کی تجویز کے مطابق حسن گانگو کو یا دشاہ مقرر کیا اور ۱۷۷۷ء میں مبارک شاہ ظہمی کی مسجد واقع دولت آباد میں اس کے سر پر تاج سلطانی رکھا، اور تمیناؤ تیرکا چتر سیاہ جو خلقائے عیاسیہ کا بانا تھا لازم شاہی میں داخل کیا۔ تمام ملک دکن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ حسن نے گلبرگہ کو مبارک خیال کر کے اسے اپنا دار السلطنت مقرر کیا اور حسن آباد نام رکھا۔

سلطان گجرات کی مہم میں مصروف تھا کہ یہ متوحش خبر دکن کے دفاع نگار نے پہنچائی، سلطان یہ خبر سنکر بید غمگین ہوا، لیکن یہ سمجھ کر کہ مخلوق اس سے ناراض ہے اور تمام فسادات اس کی کثرت سیاست کی وجہ سے بپا ہوئے ہیں چند روز کے لئے سیاست سے دست کش ہوا اور مصلحت و دقت دیکھ کر خاموشی اختیار کی۔ اور بدستور گجرات اور کرناٹک کی تسخیر میں مصروف رہا۔

۱۷۸۳ء میں سلطان کا انتقال ہوا، اس کی وفات کے وقت وہ سلطنت جو بیس سال قبل اسی کے عہد حکومت میں درہ ہائے مغربی سے دہانہ گنگا تک پھیلی ہوئی تھی گھٹ گھٹا کر بالکل کم رہ گئی۔

سلطان علاؤ الدین حسن گانگو نے اپنی حسن تدبیر رائے صائب و ضرب شمشیر سے توڑی ہی مدت میں اس قدر ملک دکن فتح کر لیا جس پر دکن تعلق کے عہد میں اس کے امراء کے تصرف میں تھا، البتہ دیچانگر کا علاقہ اس سے علیحدہ رہا، امر تعلق و افغان دراجپوت کو جو سلطان کی جانب سے قلعہ میدر و قنبار میں تھے لطف و ملامت سے مطیع و منقاد کیا، کولاس مع مصافات رائے و رنگل سے لیلیا، ادھر محمد تعلق ملک طغی کی بغاوت فرد کرنے میں ایسا مصروف رہا کہ اس کو تازیت دکن کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی، حسن نے ایک مہم کرناٹک کی طرف بھیجی اس میں بھی کامیابی ہوئی وہاں کے راجاؤں نے سالانہ خراج ادا کر نیک عہد کیا۔

امراء گجرات نے محمد تعلق کی سختیوں کی تاب نہ لا کر حسن کو بلوایا، حسن خود تو نہیں گیا مگر اپنے بیٹے شہزادہ محمد کو بھیج دیا اور بعد خود بھی عقب سے روانہ ہوا، جب شہزادہ قصبہ نوساری پہنچا تو وہاں شکار کی کثرت دیکھی اس نے سلطان (یعنی حسن) کو شکار کی دعوت دی، یہاں آنے کے چند دن بعد سلطان ہیفہ میں مبتلا ہوا، اور اسی سلسلہ میں مختلف عوارض میں مبتلا رہ کر ۱۷۸۷ء میں انتقال کیا، اس کے انتقال کے وقت اس سلطنت میں ملک مرہٹوڑی، تلنگانہ اور کرناٹک کے بھی کچھ حصے شامل تھے جن پر ہندو راجہ حکمران تھے، مشرق میں راجہ تلنگا اور جنوب میں راجہ بیجانگر، کرناٹک پر سلطنت، یہ دونوں بڑے زبردست مقابل تھے، جب سلطان حسن امور سلطنت میں مشغول ہوا تو جیسا کہ اس کے مترادف اور لائق تھا اس نے سلطنت اور جہانگیری کا کام نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا، روز بروز اس کی مملکت وسیع ہوتی گئی، دریا پونہ سے قلعہ ادھونی کے اطراف تک اور جیول و دابل سے شہر احمد آباد میدر تک اس کے حوزہ تصرف میں تھا۔

سلطان علاؤ الدین حسن گانگو کے انتقال کے بعد سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے ممالک محدودہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ ہر ایک ایک

۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۴ و تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۵۱۲ و ۵۱۵ و ۵۱۶

South India After Mohammedan Period

۲ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۹۶

منشی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

طرقدار مقرر کیا۔ اس کے زمانہ میں وزنگل کے راجہ نے سرکشی کی اور چاہا کہ قلعہ جات مرگل و راجورا واپس لیے، لیکن سلطان محمد نے وزنگل کے راجہ کو شکست دی، تین دفعہ وزنگل پر چڑھائی کرنی پڑی، آخر کار ۱۳۵۷ء میں رائے تلنگ نے متواتر دو وقت شکست کھانے کے بعد تیسری دفعہ مقابلہ کیلئے تیاری کی اور رائے بیجا نگر کو اپنا خلیفہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ سلطان نے بھی عظیم الشان تیاری کی اور زوردار حملہ کیا۔ لشکر کے دو حصے کئے کچھ وزنگل اور کچھ سکندریہ کی طرف بھیجا۔ رائے تلنگ کو رائے بیجا نگر سے کچھ مدد ملی اور اس نے کامل شکست پائی، گو لکنڈھوہ مضافات دیکر صلح کر لی، اسی سلطان نے رائے بیجا نگر پر چڑھائی کی اور اس کو کامل شکست دی، آخر کار مجبور ہو کر بیجا نگر کے راجہ نے محمد شاہ کے پاس ایلچی بھیجے اور غوث نقیر کا خواستگار ہوا۔ یہ بادشاہ عقیل و شجاع اور نہایت الواعزم اور عالی حوصلہ تھا، سپاہ کے ساتھ بہت ہی خلق و مردت کے ساتھ پیش آتا تھا، لیکن دشمنوں کے لئے نہایت سخت گیر تھا، جس سلطنت کی بنیاد سلطان علاؤ الدین نے ڈالی تھی اس کو استحکام اسی کے عہد میں حاصل ہوا، اس کے بعد جو بادشاہ سربراہ سلطنت ہوئے ان کے زمانہ میں رقبہ مملکت وسیع ہوتا گیا۔ اور اندرونی انتظامات حکومت کو استقلال پہنچاتے گئے۔ تا آنکہ محمد شاہ ثانی کا زمانہ آیا۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنت بہت وسیع ہو گئی۔ اس نے بجائے چار قسمتوں کے اپنی قلمرو کی آٹھ قسمیں قرار دیں اور ہر ایک قسمت پر ایک ایک طرقدار مقرر کیا، خوش قسمتی سے اس کو خواجہ محمود گادان جیسا شیرملگیا، جو تدبیر و سیاست اور انتظام مملکت میں ملکہ تمام رکھتا تھا۔ محمود سلطنت کا سچا خیر خواہ تھا، اور سلطان محمد شاہ ثانی سے اس کو نہایت درجہ اخلاص تھا، اسی کی کوششوں اور حسن سعی کا نتیجہ تھا کہ سلطنت کو وہ عروج ہوا، جو اس سے پہلے نہ اس کے بعد کسی اور بادشاہ دکن کے زمانہ میں حاصل ہوا۔ محمد شاہ کی بیس سالہ حکومت میں سلطنت عروج کمال کی انتہائی مدارج کو پہنچ کر زوال پذیر ہوئی، اس کے عروج و زوال کا اصلی سبب خواہ محمود کی ذات میں ضمیر ہے، یہ وہ حسرتناک اور جانسوز و دگرخراش داستان ہے جو خون کے آنسو رلاتی ہے، ایک خادم کو اپنی خیر خواہی اور حسن خدمات کا وہ صلہ ملا کہ اس نے نہ صرف اس کو بلکہ سلطنت بہمینہ کو برباد کر دیا۔

ملکناہ محمود گادان شد شہید

جنوب کی طرف صرف بیجا نگر کا علاقہ باقی رہ گیا تھا، مکن تھا کہ ایک سال کے اندر ہی اندر بیجا نگر کی سلطنت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا مگر مشیت ایزدی دوسری طرح تھی، امر کو خواجہ محمود کی روز افزوں ترقی و اقتدار کو دیکھ کر حسد پیدا ہوا، اور انھوں نے خواجہ کی دشمنی پر کمر باندھ ہی انھوں نے خواجہ کے ایک حبشی غلام کو ملا کر یہ دغا و فریب ایک سادہ کاغذ پر خواجہ کی ہر گالی، اور اس کے بعد ایک جعلی خط تیار کیا جس میں خواجہ کی طرف سے راجہ اور لیساکو لکھا کہ "اگر تم اس وقت سلطنت پر حملہ آور ہو تو میں تمہاری امداد کروں گا، اس وقت سلطنت کی حالت تازہ ہو رہی ہے اچھا موقع ہے۔"

جب وہ جعلی رقبہ سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا، سلطان خواجہ کی ہر دیکھتے ہی بہت برا فروختہ ہوا۔ اور عنان اختیار دست انداز سے چھوٹ گئی اور بدوں استفسار اور دریافت حقیقت حال خواجہ کی جلیبی کے لئے آدمی بھیجا اور خواجہ کے قتل کا حکم دیا۔ ایک غلام نے خیر خواہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ ایک ایسی زبردست شخصیت کے اٹھ جانے کی وجہ سے ملک میں بد امنی پھیلی، خود غرض امر اس کشتی پر آمادہ ہوئے نشتر میں سرشار بادشاہ بھی زیادہ عرصہ تک چین سے حکومت نہ کر سکا۔ خواجہ کے قتل کے ایک ہی سال بعد ۱۳۷۷ء میں اس نے وفات پائی اس میں کوئی شک نہیں کہ جس ضرب سے کہ

۱۵ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۵۷

۱۶ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۵۸

خواجہ محمود کا کام تمام کیا گیا، اسی ضرب نے سلطنت بہمنہ کا طبقہ الٹ دیا۔ سلطان محمد شاہ کی موت سلطنت بہمنہ کی موت تھی، امرائے اس کی وفات کے بعد علم بغاوت بلند کیا، اور ہر طرف خود غرض امر اشغلی اقتدار قائم کرنے کی فکر میں پڑ گئے سامعی نے اس بادشاہ کی تاریخ وفات کہی ہے ۵

دکن چون شد خراب از دقت

خرابی دکن تاریخ او شد

خواجہ کے قتل کی خبر ستر عداد الملک اور خداوند خان اپنا اپنا لشکر لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بے سبب خواجہ کو قتل کرنے پر اظہار افسوس کیا، اسی دوران میں یوسف عادل خاں بھی آگیا بادشاہ نے بیجا پور کا تمام علاقہ جو خواجہ کے ماتحت تھا، یوسف کو عطا کیا۔ حسن نظام الملک بھری جس کی سازش کی وجہ سے خواجہ قتل کیا گیا تھا سلطنت کا نائب اور پیشوا مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اعداد خند سلطنت کے جملہ امور نظام الملک کے سپرد کر دیے بادشاہ کی اس کارروائی سے تمام امرائے ترک بد دل ہو گئے چونکہ یوسف عادل خاں کی قوت بہ نسبت دیگر امرائے بہت بڑی ہوئی تھی اس لئے بادشاہ اس کی خرابی کے درپے ہوا، اور اسے دور دور کی مہمات پر روانہ کرنا شروع کیا۔ جب یوسف عادل خاں کو محمد شاہ کی وفات اور محمود شاہ کی تخت نشینی کی خبر ملی، تو مبارکباد کے لئے دار الخلافہ آیا، چونکہ نظام الملک اور یوسف عادل خاں کے تعلقات اچھے نہ تھے اور ان میں چشمک تھی اور وہ اس کی ہر تعزیری اور قوت سے متوہم تھا اس لئے اس کے درپے آزار ہوا، اور اس کے خلاف سازش شروع کی۔

چونکہ نظام الملک کی تختی اور خود غرضانہ مختاری کی وجہ سے امر بد دل ہو گئے تھے اس لئے دلا درخان حبشی نے بادشاہ کو یہ باور کرا کے کہ اس نے بادشاہ کو عضو معطل بنا رکھا ہے اس کا کام تمام کر نیکا مشورہ دیا، جس پر بادشاہ نے اپنی رہنمائی ظاہر کی چنانچہ دل پسند خاں نے نظام الملک کو قتل کر کے اس کا سر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔

بادشاہ عیش و نشاط میں مصروف ہوا، اور ملک کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی، صورت حال کو نیچے موانق دیکھ کر حکام اپنے انتظام کی کوشش میں پڑ گئے تھوڑی ہی مدت میں بادشاہ کے تصرف میں مملکت تلنگ اور حوالی و حواشی بیدر کے سوا کوئی علاقہ نہ رہا، گو اس وقت تک تمام طرفدار سوا ملک احمد بھری (فرزند نظام الملک) کے ظاہری اطاعت کرتے تھے، لیکن ملک احمد نے باپ کے قتل کی خبر ستر بغاوت کی اور پیر اور تمام کونکن کے علاقہ پر قبضہ کر لیا خود بادشاہ بن کر اپنے نام کے ساتھ نظام الملک کا خطاب بھی ایزاد کیا، اور اپنے ایلچی عادل خاں اور عداد الملک کے پاس بھیج کر ان کو یہی خود مختاری کے اعلان کر نیکا مشورہ دیا۔

اسی زمانہ میں قاسم برید منصب وکالت پر مامور ہوا، اور ایسا ہی اثر ہو گیا کہ سلطان محمود برائے نام بادشاہ رہا، تمام امور مملکت اسی کے ذریعہ انجام پائے۔



۱۵ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۱۵

۱۶ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۱۵

۱۷ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۱۵

۱۸ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۱۵ و ص ۲۱۶

۱۹ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۱۵

اسی وجہ سے مورخین سلطنت بریڈیر کی ابتدا اسی سال ۱۷۹۳ء سے شمار کرتے ہیں ۱۵
الغرض مملکت بہمنیہ پانچ سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی۔

۱	عادل شاہی
۲	نظام شاہی
۳	عماد شاہی
۴	قطب شاہی
۵	بریڈ شاہی

گو محمود شاہ کے بعد بھی فاندان بہمنیہ کے چار اور بادشاہ تخت نشین ہوئے لیکن ان کی بادشاہت برائے نام تھی، اور وہ بریڈیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کے مانند تھے!

ان پانچ سلطنتوں کے قائم ہوجانے کے بعد ان سلطنتوں کے تعلقات کی داستان نہایت وضاحت کی محتاج ہے، بقول پروفیسر مینی پرشاد:-

”دکن کی ان پانچ سلطنتوں کی سیاسی تاریخ اندرونی تفاق اور بیرونی حملوں کا ایک وسیع دفتر ہے، ہندوؤں کی عظیم الشان سلطنت، بیجا نگر کا وجود اس الجھاؤ اور دقتوں میں اور اضافہ کا باعث ہوئی، بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ بیجا پور اور گولکنڈہ کی سیاسیات، جنوبی اثر سے متاثر ہو گئی، لیکن رام راج کے بڑے ہوئے حوصلوں نے بیجا پور، گولکنڈہ اور احمد نگر کو باہمی اتحاد پر مجبور کیا، اور اتحادیوں نے اس سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۱۷۶۹ء کی جنگ تالیکوٹہ نے بیجا نگر کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا“

شمالی ہند میں کسی مستحکم قوت کی نہونے کی وجہ سے دکن کو سیاسی فروغ کے لئے بہت اچھا موقع ملا، بالآخر سولہویں صدی میں اسی قدیم طرز عمل کا اعادہ کیا گیا جو دو نہر اسل سل سے شمال اور جنوب کے درمیان جاری تھا۔ یعنی جب شمالی ہند میں اکبر کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان جنگ جہاں کا سلسلہ شروع ہوا، برار، احمد نگر کا جزو ہو چکا تھا، بیدر کی قوت انحطاط پر تھی، اور بھرت فاندیس، احمد نگر، گولکنڈہ، اور بیجا پور کی ایسی سلطنتیں تھیں جن سے اکبر کو مقابلہ کرنا تھا۔

۱۷۹۱ء میں اکبر نے اس سلطنتوں کے پاس ایچی بھیجے تاکہ بغیر جنگ و جدال کے کام نکل آئے، سب سے پہلے فاندیس کی مختصر سی ریاست نے اطاعت اختیار کی، دیگر سلطنتوں نے گول مول جواب دیا۔

دکن کے دول کے درمیان خانہ جنگی جاتی ہے۔ صلاً احمد نگر اور بیجا پور کی تاریخ تو جنگ و جدال کا مرقع ہے۔ احمد نگر میں مرفی نظام شاہ اور گولکنڈہ میں

۱۷۹۱ء تا ۱۷۹۳ء فرشتہ جلد ۱، اس کی آنکھوں کو کیا ہو گیا؟

مضافات

۱۷۹۱ء تا ۱۷۹۳ء نہیں نہیں یہ دیکھو (اس کو ٹھکراتا ہے)

۱۷۹۳ء اسے یہ نہ کرو۔ یہ جاگتا کیوں نہیں؟

محمد تلی قطب شاہ اور بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ حکومت کر رہے تھے، قطب شاہی اور نظام شاہی افواج ابراہیم عادل شاہ کی کمسنی سے فائدہ اٹھانے کے لئے حملہ آور ہوئی لیکن بالآخر صلح ہو گئی ۹۹۲ھ میں ابراہیم عادل شاہ کی ہمیشہ کا نکاح مرتضیٰ نظام شاہ کے بیٹے میران نظام شاہ سے ہوا۔ اور ۹۹۵ھ میں ابراہیم عادل شاہ نے محمد تلی قطب شاہ کی بہن سے نکاح کیا۔^{۱۵}

برہان نظام شاہ نے دو وقت بیجاپور پر چڑھائی کی اور دونوں وقت شکست کھائی، اس کے بعد برہان نظام شاہ کا انتقال ہو گیا، اور احمد نگر کے تخت پر ابراہیم شاہ متمکن ہوا۔ احمد نگر کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ تھی، وہاں دو فریق میان سمجھو اور اخلاص خاں بہت طاقتور تھے اور ایک دوسرے کے مخالف تھے، ایک فریق اکبر سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا، اور دوسرا ابراہیم عادل شاہ سے مدافعت، آخر کار اخلاص خاں کی تحریک سے نظام شاہی فوج نے ابراہیم عادل شاہ کے علاقہ پر چڑھائی کی، ۹۹۵ھ میں ابراہیم عادل شاہ نے ان کو کامل شکست دی، اور ابراہیم شاہ مارا گیا، جس کے مرنے کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ چونکہ سلطنت احمد نگر حدود مغلیہ سے بہت قریب واقع ہوئی تھی اس لئے ۹۹۵ھ اکبر نے شہزادہ دانیال کو مع خانخانان کے احمد نگر کی طرف روانہ کیا اور بعدہ بجائے دانیال کے مراد کو نامزد کیا، لیکن بقول صاحب طبقات اکبری سپہ سالاروں کے درمیان اتفاق نہ تھا، لہذا اس باہمی اتفاق اور دکن کے رویہ نے ان کے بازوؤں کو شل کر دیا۔ علاوہ ازیں اس موقع پر چاند سلطانی ہمیشہ برہان نظام الدین شاہ نے قلعہ احمد نگر کی محاطت کا بڑا اٹھالیا، بالآخر دونوں فریق صلح پر راضی ہوئے اور ۹۹۶ھ میں صلح ہو گئی، جس کی رو سے برار کا الحاق مغلیہ سلطنت سے ہو گیا۔ اور احمد نگر نے مغلوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔ چاند سلطانی نے آئینوالے خطرہ کو اچھی طرح محسوس کر لیا اور اس مشترکہ خطرہ کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کو متحد کیا، بعد ازاں خاندیس بھی شریک ہو گیا، لیکن اس متحدہ قوتوں کی مدافعت کے باوجود بھی مغلوں کو میدان سوبہ میں فتح حاصل ہوئی، احمد نگر مفتوح ہو گیا مگر پوری طرح الحاق نہ ہو سکا۔

خانخانان کی فیروز خلی پہلے سے مشہور تھی اس فتح سے اس کی اور بھی ناموری ہو گئی، مگر شاہزادہ مراد اور خانخانان میں کشیدگی پیدا ہو گئی، جس کی وجہ سے شہنشاہ اکبر نے شاہزادہ کی رعایت و خاطر داری ملحوظ رکھ کر شہنشاہ میں خانخانان کو واپس بلا لیا۔ اور اس کی بجائے ابوالفضل کو اس عہدہ پر مامور کیا۔

لیکن پھر احمد نگر میں مخالفت شروع ہوئی اور اکبر جو سرحدی معاملات سے فراغت حاصل کر چکا تھا ۹۹۷ھ میں دکن کی طرف روانہ ہوا۔^{۱۶} یہ معلوم کر کے کہ خاندیس بھی بغاوت پر آمادہ ہے خود اس طرف متوجہ ہوا، اور دانیال و خانخانان کو احمد نگر کی طرف بھیجا۔ اور ہر احمد نگر میں اندرونی اختلافات، فساد و نا اتفاقی اور نظمی نے چاند سلطانی کا خاتمہ کر دیا، اکبر نے کچھ دنوں پیش شاہاں بیجاپور اور گولکنڈہ کے پاس سفیر بھیجے تھے تاکہ وہ انکو اطاعت کرنے اور پیشکش کرنے پر آمادہ کریں۔ بیجاپور جو سفیر بھیجا گیا تھا اس نے اکبر کی زور و قوت کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ ابراہیم عادل شاہ نے اطاعت قبول کر لی اور پیشکش روانہ کیا۔^{۱۷}

سعدی بی، اے علیگ کلیرک

(باقی) — فروری میں دیکھئے

۱۵ بایقن السلاطین ص ۱۹۱ و ۱۹۲

۱۶ بایقن السلاطین ص ۲۲۸ و ۲۲۹

۱۷ بایقن السلاطین ص ۲۵۴

۱۸ بایقن السلاطین ص ۲۵۵

عمر لکھنؤ سے ملتا ہے

آغازِ ہستی

(ڈراما)

باب اول

بلخ عدن۔ سپر کا وقت۔ ایک بڑا سانپ اپنا سر پھولوں کی ایک کیاری میں چھپائے ہوئے اور اپنے جسم کو ایک درخت کی شاخوں میں لپیٹے ہوئے آرام کر رہا ہے درخت اچھی طرح پروان چڑھ چکا ہے کیونکہ آفرینش کے دن ہمارے قیاس سے کہیں زیادہ طویل تھے۔ سانپ اس شخص کو نہیں دکھائی دیکتا جس کو اس کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے سبز اور بھورے رنگ کے میل سے دھوکا ہوتا ہے اس کے قریب پھولوں کی کیاری سے بلند ایک چٹان نظر آرہی ہے۔ یہ چٹان اور درخت دونوں ایک سبز زار کے کنارے واقع ہیں، جس میں ایک ہر کا بچہ مرا اور سوکھا ہوا پڑا ہے، اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے، آدم اپنے ایک ہات کے صہائے چٹان پر جھکا ہوا مردہ جسم کو دہشت سے دیکھ رہا ہے، اس نے اپنے بائیں طرف سانپ کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ اپنے طرف مڑتا ہے اور گھبرا کر آواز دیتا ہے۔

آدم معلوم نہیں، سو نہیں رہا ہے۔

خوآ سو نہیں رہا ہے۔؟

آدم دیکھو تو!

خوآ (ہرن کے بچہ کو ہلانے اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) یہ تو سخت

اور ٹھنڈا ہو گیا ہے!

آدم کوئی شے اس کو جگا نہیں سکتی۔

خوآ اس میں تو عجیب دمک ہے۔ اُٹ اپنا ہات جھاڑتی ہے اور اس کے

پاس سے ہٹ جاتی ہے (کیا تم نے اسکو اسی حالت میں پایا تھا؟)

آدم خوا! خوا!

خوآ کیا ہے، آدم؟

آدم یہاں آؤ۔ جلد بچہ ہو گیا ہے!

خوآ (دوڑ کر) کیا کہاں؟ (آدم ہرن کے بچہ کی طرف اشارہ کرتا ہے،

اُٹ! وہ اس کے پاس جاتی ہے، آدم کو بھی اس کے ساتھ جانیکی

جرات ہوتی ہے، اس کی آنکھوں کو کیا ہو گیا؟

آدم صرف آنکھیں نہیں، یہ دیکھو (اس کو ٹھکراتا ہے)

خوآ ارے یہ نہ کرو۔ یہ جاگتا کیوں نہیں؟

آدم: نہیں ابھی کھیل رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر لو کھڑا ہوا اگر پڑا۔ پھر اس نے غصہ میں
 نہیں کی اس کی گردن میں کوئی خرابی ہو گئی ہے (گردن اٹھا کر حوا کو
 دکھانے کے لئے جھکتا ہے)
 حوا: مت چھو، اس کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ (دونوں پیچھے ہٹ جاتے ہیں
 اور چند قدم کے فاصلہ سے لاش پر بڑھتی ہوئی نفرت سے غور
 کرتے ہیں)
 حوا: آدم!
 آدم: ہاں۔
 حوا: فرض کرو کہ تم ٹھوکر کھا کر گر پڑو تو کیا تم بھی اسی طرح چلے جاؤ گے۔
 آدم: اُف! (تھرا جاتا ہے اور چٹان پر بیٹھ جاتا ہے)
 حوا: (اس کے پہلو میں بیٹھ کر اور اس کے گھٹنوں کو تھام کر) تم کو اسکا
 خیال رکھنا چاہیے، وعدہ کرو کہ خیال رکھو گے۔
 آدم: خیال رکھنے سے فائدہ کیا ہے ہم کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے، دیکھتی ہو ہمیشہ
 کے کیا معنی ہیں ایک نہ ایک دن میں بھی ٹھوکر کھا جاؤنگا اور گر پڑوں گا
 ممکن ہے کل ہی، اور ممکن ہے اٹنے دنوں بعد تبھی کہ اس باغ میں تپاں
 میں یا دریائے کنارے ریت کے ذرے میں بہر حال میں بھول جاؤنگا
 اور ٹھوکر کھا جاؤنگا
 حوا: میں بھی۔
 آدم: (سہم کر) نہیں نہیں میں تمہارے جاؤنگا اور ہمیشہ کے لئے، تم کبھی
 اپنے کو اس خطرے میں ڈالنا تم چلا نہ کرو، ساکت بیٹھی رہا کرو میں
 تمہاری حفاظت کروں گا، اور جس چیز کی تم کو ضرورت ہوگی، خود
 لا کر دوں گا۔
 حوا: (جھکتے ہوئے اس کی جانب سے منہ پھیر کر اور اپنی کھینوں کو تھام
 کر) میں اس طرح جلد گھبرا جاؤں گی اس کے علاوہ تمہارا یہ انجام
 ہوا تو پھر میں تمہارا بھاؤں گی، اس وقت بیکانہ میٹھی نہ رہ سکوں گی۔
 آدم: اور آکر حکم کر رہی رہی وہی انجام ہوگا۔
 آدم: اور پھر؟
 حوا: پر ہم نہیں ہوں گے۔ صرف چوپائے، پرندے اور سانپ ہوں گے۔
 آدم: یہ نہ ہونا چاہیے۔
 حوا: ہاں نہ ہونا چاہیے مگر ہو سکتا ہے۔
 آدم: نہیں، کہتا ہوں کہ نہیں ہونا چاہیے، میں جانتا ہوں کہ ایسا
 نہیں ہوگا۔
 حوا: ہم دونوں جانتے ہیں، لیکن کیسے جانتے ہیں؟
 آدم: بلحاظ میں ایک "آواز" ہے جو بھگو بائیں بتایا کرتی ہے۔
 حوا: بلوغ تو آوازوں سے بھرا ہوا ہے، جو میرے سر میں نے نئے
 خیالات لاتی رہتی ہیں۔
 آدم: میرے لئے صرف ایک آواز ہے جو بہت دہی ہے، لیکن اس قدر
 قریب ہے گویا میرے اندر سے آرہی ہے اس آواز میں اور
 چڑیلوں کی یا چوپایوں کی یا خود اپنی آواز میں کوئی دہوکا نہیں
 ہو سکتا۔
 حوا: تعجب ہے کہ میں تو ہر سمت سے آوازیں سنتی ہوں اور تم صرف ایک
 "آواز" اپنے اندر سے، لیکن میرے بعض خیالات ایسے بھی ہیں جو
 آوازوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ میرے اندر سے آتے ہیں۔
 آدم: یہ خیال کہ ہم کبھی نیست نہیں میرے اندر سے آیا ہے۔
 حوا: لیکن ہم نیست ہو جائیں گے۔ اس ہرن کے بچہ کی طرح ہم بھی گر نینگے
 اور۔۔۔۔۔ (اٹھ کر گہرا ہٹ میں ادھر ادھر ہر ٹھٹھنے لگتا ہے)
 میں اس علم کی تاب نہیں لا سکتا، مجھے اس کی ضرورت نہیں میں
 تم سے کہتا ہوں ایسا نہیں ہونا چاہیے، پھر بھی یہ نہیں جانتا کہ کس
 طرح روکوں۔
 حوا: میں بھی محسوس کرتی ہوں، حیرت کی بات ہے کہ تم ۲۱۔

کہ ہے ہو، تم کو کسی حالت میں چین نہیں تم ہمیشہ اپنا خیال بولتے رہتے ہو۔

آدم (ڈانٹ کر) یہ کیوں کہتی ہو، میں نے اپنا خیال کب بدلا ہے؟
 حوا تم کہتے ہو کہ ہم کو نصیب نہ ہونا چاہیے لیکن تمہیں اس کی شکایت کیا کرتے تھے کہ ہم کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے، بعض اوقات تم گھنٹوں چپ چاپ سو جا کرتے ہو، اور دل ہی دل میں مجھ سے کہتے رہتے ہو، جب میں پوچھتی ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے تو تم کہتے ہو تمہارے بارے میں نہیں بلکہ اپنے یہاں ہمیشہ رہنے کی مصیبت پر غور کر رہا تھا، مگر میں سمجھتی ہوں کہ تم جس چیز کو مصیبت کہتے ہو وہ یہاں ہمیشہ میرے ساتھ رہنا ہے۔

آدم تم یہ سوچتی ہو کیوں؟ نہیں تم غلطی پر ہو وہ مضحک ٹیو جاتا ہے اصل مصیبت تو ہمیشہ اپنے ساتھ رہنا، میں تم کو چاہتا ہوں لیکن اپنے کو نہیں چاہتا، میں کچھ اور ہونا چاہتا ہوں، اس سے بہتر میں چاہتا ہوں کہ میرا بار بار پر سے آغاز ہوتا رہے جس طرح سانپ کچل بدلتا رہتا ہے اسی طرح میں بھی اپنے کو بدلتا رہوں، میں اپنے سے عاجز ہو گیا ہوں لیکن مجھ کو بہر حال برداشت کرنا ہے، ایک دن یا کئی دن کے لئے بلکہ ہمیشہ کے لئے یہ ایک ڈرا دینے والا خیال ہے۔ اسی پر غور کرنا غور کیا کرتا ہوں اور کڑھتا ہوں، کیا تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا؟
 حوا میں اپنے متعلق غور نہیں کرتی، اس سے کیا فائدہ؟ میں جوں ہوں سو ہوں، کوئی چیز اس کو بدل نہیں سکتی میں تمہارے متعلق غور کرتی رہتی ہوں۔

آدم یہ ٹھیک نہیں۔ تم ہر وقت میری کہوچ میں لگی رہتی ہو، تم کو ہمیشہ یہ جاننے کی فکر رہتی ہے کہ میں کیا کرتا رہتا ہوں یہ تو ایک بار معلوم ہوتا ہے بجائے اس کے کہ اپنے کو میرے ساتھ مشغول رکھو تم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ تمہارا ایک اپنا ذاتی وجود علیحدہ ہو۔

حوا

آدم

حوا

آدم

حوا

آدم

حوا

آدم

حوا

سانپ، حوا۔

حوا کون ہے؟

مجھ کو تمہارا خیال رکھنا ہے، تم سنت ہو بیٹے رہتے ہو۔ اپنی خبر نہیں رکھتے، ہر دم خواب دیکھتے رہتے ہو، اگر میں اپنے کو تمہارے ساتھ مشغول نہ رکھوں تو تم خراب کھانا کھانے لگو گے اور قابل نفرت ہو جاؤ گے، اس پر بھی باوجود میری تمام نگرانی کے تم کسی روز سر کے بل گر پڑو گے اور مردہ ہو جاؤ گے۔

مردہ؟ یہ کونسا لفظ ہے؟

آدم (ہرن کے بچے کی طرف اشارہ کر کے) اس کی طرح میں اس کو مردہ کہتی ہوں۔

آدم (اٹھ کر بچے کے پاس جاتے ہوئے) اس میں کوئی غیر مانوس بات معلوم ہوتی ہے۔

حوا (آدم کے پاس جاتے ہوئے) یہ تو سفید چھوٹے کپڑوں کی صورت میں تبدیل ہو رہا ہے!

آدم اس کو دریا میں پھینک دو یہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

حوا میں اس کو چھونے کی ہمت نہیں کر سکتی۔

آدم تو میں ہی پھینک آؤں اگرچہ مجھے اس سے کراہیت معلوم ہو رہی ہے، یہ ہوا کو زہر یا کرہا ہے (سموں کو اپنے ہاتھ سے کر لاش کو اپنے جسم سے جانتا مکھن ہے دروازے کھائے ہوئے اس طرف جاتا ہے جس طرف سے حوا آئی تھی)

حوا ان کی سمت ایک لمحہ تک دیکھتی رہتی ہے، پھر نفرت کی ایک لرزش کے ساتھ چٹان پر بیٹھ جاتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے۔ سانپ کا جسم دلکش نئے رنگوں سے چمکتا نظر آتا ہے، وہ پھولوں کی کیاری سے اہستہ سے اپنا سر اٹھاتا ہے اور حوا کے کان میں ایک عجیب دلفریب پر ترخم آواز میں کہتا ہے۔

سانپ، حوا۔

حوا کون ہے؟

سانپ۔ میں ہوں۔ تم کو اپنا خوبصورت نیا پہن دکھانے آیا ہوں دیکھو۔ وہ
ایک خوشنما بیل میں اپنا پہن پھیلا دیتا ہے)

حوا ابا! مگر تمہکو بولنا کس نے سکھایا؟
سانپ؛ تم نے اور آدم نے، میں گھاس میں چھپ کر تمہاری باتیں ناکرنا ہوں؛
حوا یہ تیری بڑی عقلمندی ہے۔

سانپ، میں اس میدان کے جانوروں میں سب سے زیادہ ہوشیار ہوں
حوا تیرا پہن بہت خوبصورت ہے، پہن کو تھپکتی ہے اور سانپ کو پیار کرتی
ہے، اچھے سانپ کیا تو اپنی دیوی مانا حوا کو چاہتا ہے؟

سانپ میں اسکو بوجھا ہوں۔ (حوا کی گردن کو اپنی دھری زبان سے چاٹتا ہے)
حوا (اس کو پیار کرتے ہوئے) حوا کے پیارے سانپ، اب حوا کبھی اکیلی
نہ رہے گی کیونکہ اس کا سانپ باتیں کر سکتا ہے۔

سانپ میں بہت سی چیزوں کے بارے میں باتیں کر سکتا ہوں، میں بڑا عقلمند
ہوں یہ میں ہی تھا جس نے تمہارے کان میں ہستہ سے وہ لفظ کہنا
تھا۔ جو تم کو نہیں معلوم تھا۔ مردہ۔ موت۔ مرنا۔

حوا (کانپ کر) اس کی یاد کیوں دلاتا ہے؟ میں تیرا خوبصورت پہن دیکھ کر
اس کو بول گئی تھی، تمہکو خوش چیزوں کی یاد نہیں دلانا چاہیے۔

سانپ موت خوش چیزیں اگر تم نے اس پر فتح پانا سیکھ لیا ہے۔
حوا میں موت پر فتح کیسے پاسکتی ہوں؟

سانپ ایک دوسری چیز کے ذریعہ سے جس کو پیدائش کہتے ہیں۔
حوا (تللفظ کی کوشش کرتے ہوئے) پے۔ دائش؟

سانپ ہاں پیدائش۔
حوا پیدائش کیا ہے؟

سانپ سانپ کبھی مرنے نہیں۔ تم کسی روز دیکھو گی کہ میں اس خوبصورت کچل سے
ایک نیا سانپ بن کر اور اس سے زیادہ خوبصورت کچل لیکر باہر نکلاؤں گا
یہی پیدائش ہے۔

حوا میں ایسا دیکھ چکی ہوں، بڑے تعجب کی بات ہے۔

سانپ میں بڑا ہوشیار ہوں، جب تم اور آدم باتیں کرتے ہو تو میں تم کو
”کیوں“ کہتے ہوئے سنتا ہوں، ہر دم ”کیوں“ تم آنکھوں سے
چیزوں کو دیکھتی ہو اور کہتی ہو ”کیوں؟“ میں خواب میں دیکھتا
ہوں اور کہتا ہوں ”کیوں نہیں؟“ میں نے لفظ ”مردہ“ خود بنایا
ہے، جس سے مراد میری پرانی کچل ہے جس کو میں نے تجدید کی وقت
اتار کر پھینک دیا اس تجدید کو میں پیدا ہونا کہتا ہوں۔

حوا ”پیدا“ ایک خوبصورت لفظ ہے۔

سانپ کیوں نہیں میری طرح بار بار پیدا ہوا اور ہمیشہ نئی اور خوبصورت بنی ہو؟
حوا میں! اس لئے کہ ایسا ہوتا نہیں اور کیوں نہیں۔

سانپ ”مردہ“ تو کیسے ہوا ”کیوں نہیں؟“ تو نہیں جانتا ”کیوں نہیں؟“
حوا لیکن میں اس کو پسند نہیں کروں گی، پہرے نیا بننا اچھی بات ہے
مگر میری پرانی جلد زمین پر بالکل میری طرح پڑی رہے گی، آدم اسکو
سکڑتے ہوئے دیکھے گا اور

سانپ نہیں اس کی ضرورت نہیں، ایک دوسری پیدائش ہی ہے۔
حوا دوسری پیدائش؟

سانپ سنو تم کو ایک بڑا راز بتاتا ہوں، میں بڑا عقلمند ہوں، میں سوچتا رہتا ہوں
میں ارادہ کا پکا ہوں، اور جس چیز کی مجھ کو ضرورت ہوتی ہے اسکو
مائل کر لیتا ہوں، میں اپنے ارادہ سے کام لیتا رہا ہوں، اور
میں نے عجیب عجیب چیزیں کھائی ہیں۔ پتھر سیب جن کو کھاتے ہوئے
تم ڈرتی ہو۔

حوا تمہاری یہ ہمت!

سانپ مجھے ہر بات کی ہمت ہوئی۔ اور آخر کار مجھے ایک ایسا طریقہ معلوم
ہو گیا جس سے میں اپنی زندگی کا ایک جزو اپنے جسم کے اندر محفوظ
رکھ سکوں۔

حوا زندگی کس کو کہتے ہیں؟

سناپ وہ چیز جو مردہ اور جاندار ہرن کے کچھ میں تفریق کرتی ہے۔

حوا کیا حین لفظ ہے اور کیسی حیرت انگیز چیز ہے! زندگی تمام الفاظ میں سب سے پیارا لفظ ہے۔

سناپ ہاں زندگی ہی پر غور و فکر کرنے سے میں نے معجزے دکھانے کی قوت حاصل کی ہے۔

حوا معجزے؟ پہر ایک نیا لفظ!

سناپ معجزہ اس ناممکن بات کو کہتے ہیں جو ہر حال ممکن ہوتی ہے، کوئی ایسی بات جو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن ہو جاتی ہے۔

حوا مجھے کوئی معجزہ بتاؤ جو تم نے کیا ہو۔

سناپ میں نے اپنی زندگی کا ایک جزو اپنے جسم کے اندر اکٹھا جمع کیا اور اس کو ایک خانہ میں بند کیا جو ان پتھروں سے بنا تھا جن کو میں نے کھایا تھا۔

حوا اور اس سے کیا فائدہ ہوا؟

سناپ میں نے اس چھوٹے خانہ کو دھوپ دکھائی اور سورج کی گرمی میں رکھ دیا وہ پھٹ گیا اور اس میں سے ایک چھوٹا سانپ نکل آیا جو روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ میرے برابر ہو گیا۔ یہی تھی دوسری پیدائش۔

حوا اوہو! یہ تو حیرت انگیز ہے۔ یہ تو میرے اندر بھی حرکت کر رہی ہے اور مجھ کو زخمی کئے ڈالتی ہے۔

سناپ اس نے قریب قریب مجھ کو پھاڑ ڈالا تھا، مگر اس پر بھی میں زندہ ہوں اور پہر اپنی جلد کو پھاڑ کر اپنے کو اسی طرح پیدا کر سکتا ہوں، غریب عین میں اتنے سانپ ہو جائیں گے جتنے کہ میرے جسم پر چڑھیں ہیں اس وقت موت کچھ نہ کر سکیگی یہ سانپ اور وہ سانپ مرنے رہیں گے لیکن سانپ باقی رہے گا۔

حوا مگر سانپ کے علاوہ ہم سب کبھی نہ کبھی مر جائیں گے اور تب کچھ اور باقی

نہ رہیگا ہر جگہ سانپ ہی سانپ رہ جائیں گے۔

سناپ یہ نہ ہونا چاہیے۔ تو اس تم کو پوچھا ہوں، میرے پوجنے کے لئے کوئی نہ کوئی چیز ہونی چاہیے جو تمہاری طرح مجھ سے بالکل مختلف ہو کوئی چیز سانپ سے برتر ضرور ہونی چاہیے۔

حوا ہاں یہ نہ ہونا چاہیے۔ آدم نیست نہو، تم بڑے عقلمند ہو، بتاؤ میں کیا کروں؟

سناپ سوچو۔ ارادہ کرو۔ مٹی کھاؤ، سفید پتھر کو چاٹو، اس سب کو کچھ جس تم ڈرتی ہو، سوچ تم کو زندگی دیگا۔

حوا سوچ پر مجھ کو ہر وہ نہیں میں خود زندگی دوں گی، میں اپنے جسم کو چیر کر دوسرا آدم نکالوں گی خواہ ایسا کرنے میں میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائیں۔

سناپ ضرور ہمت کرو۔ ہر بات ممکن ہے ہر بات سنو۔ میں بڑھا ہوں۔

آدم اور حوا سے بھی بڑھا ہوں مجھے اب تک اللہ یاد ہے جو آدم و حوا سے پہلے تھی جس طرح میں تم کو عزیمتوں اسی طرح اس کو بھی

تھا۔ وہ تمہا تھی اس کے ساتھ کوئی مرد نہ تھا، جس طرح ہرن کے بچے

کو گراہوا دیکھ کر تم نے موت دیکھ لی اسی طرح اس نے پیدائش

تھا تب اس کو خیال ہوا کہ از سر نو پیدا ہو پھر نہیں ہو سکتی

کو برتنے کی کوئی تدبیر نکالنی چاہی۔

تھا، وہ کوشش کرتی رہا یہ ایک زبردست خیال ہے

عام طور پر یہ روایت مشہور ہے پتھر نہیں، البتہ ایسی چیزیں ہیں جو

کی سزا میں وہ باغ عدن سے نکالو بھی ہوا کہا تا ہے۔

ہے مگر نظر نہیں آتی۔ وہ حوا کی ات سوچی ہے، میں اس کو آدم سے کوئی

اسی سے منسوب کی جاتی ہے لے، آدم، آو! آو!

ماں خیال کرتے ہیں۔

پتیاں ہیں ان سے بھی زیادہ مہینوں تک ارادہ کرتی رہی، اس کا کرب و خفاک تھا، اس کی کراہ نے عدن کو خواب سے محروم کر دیا تھا اس نے کہا اب ایسا ہونا چاہیے تجدید زندگی کا بار برداشت سے باہر ہے ان کے لئے یہ تکلیف بہت زیادہ ہے، اور جب اس نے اپنا جسم چلاتا تو ایک لٹ نہ تھی بلکہ دو تھیں۔ ایک تمہاری طرح دوسری آدم کی طرح۔ ایک جڑا تھی، دوسرا آدم تھا۔

لیکن اس نے اپنے کو دو میں کیوں تقسیم کیا اور کیوں ہوا ایک دوسرے سے مختلف بنا یا۔

سناپ کہتا تو ہوں کہ یہ محنت ایک کی برداشت سے بہت زیادہ ہے، میں دو کو شریک رہنا چاہیے۔

خدا کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ میرے ساتھ آدم کو بھی اس تکلیف میں شریک ہونا پڑے گا؟ نہیں وہ نہیں شریک ہوگا، وہ اس محنت کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ جسم پر کوئی تکلیف اٹھا سکتا۔

سناپ اس کی ضرورت نہیں اس کے لئے کوئی محنت نہ ہوگی، وہ خود شریک ہونے کے لئے تم سے التجا کرے گا، وہ اپنی خواہش کے ذریعہ تمہارے ساتھ ہوگا۔

سناپ موت بخوش بھرے گی، لیکن کیسے؟ لٹ نے اس معجزہ کو کیسے کیا؟

خدا میں موت پر فتح کیسے پائی؟

سناپ ایک دوسری چیز کے ذریعہ۔

خدا تلفظ کی کوشش کرتے ہوئے دھچپ داستان بیان کی جو ایک

سناپ ہاں پیدائش۔

خدا پیدائش کیا ہے؟

سناپ سناپ کہی مرتا نہیں۔ تم کسی روز دیکھو کہ وہ کروا اور آخر کار جس چیز کا

ایک نیا سناپ بنکر اور اس سے زیادہ

یہی پیدائش ہے۔

کتنی ہوں؟

سناپ

ہر چیز عدم ہی سے پیدا ہوئی ہوگی، اپنے مضبوط پر گوشت کو دیکھو۔ ہمیشہ وہاں نہیں تھا۔ جب میں نے پہلے پہل تم کو دیکھا تو تم درخت پر نہیں چڑھ سکتی تھیں، مگر تم ارادہ کرتی رہو اور کوشش کرتی رہو اور تمہارے ارادہ نے محض عدم سے تمہارے بازوؤں پر گوشت کا یہ کوٹھڑا پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ تمہاری خواہش پوری ہو گئی اور تم ایک ہات کے سہارے اپنے کو اوپر کھینچ کر درخت کی اس ڈال پر بیٹھ جانے کے قابل ہو گئی جو تمہارے سر سے اوجھتی تھی۔

خدا

سناپ

وہ تو مشق تھی۔

شوق سے چیزیں گھس جاتی ہیں، بڑھتی نہیں، تمہارے بال ہوا میں

لہر رہے ہیں جیسے کھنجر ٹرہو جانے کی کوشش کر رہے ہوں، لیکن

یاد جو اس مشق کے وہ بڑھ نہیں پاتے صرف اس لئے کہ تم نے ارادہ

نہیں کیا ہے۔ جب لٹ نے جو کچھ تصور کیا تھا، اس کو خاموش

زبان میں رکھ کر اس وقت تک الفاظ نہیں تھے، مجھ سے

بیان کیا تو میں نے اس کو صلاح دی کہ خواہش کرو پھر ارادہ کرو

اور ہم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جس چیز کی اس نے خواہش کی تھی

اور ارادہ کیا تھا وہ اس کے ارادہ کی تحریک سے خود بخود اس کے

اندر پیدا ہو گئی، اب میں نے بھی ارادہ کیا کہ اپنے کو بد لکر بجائے

ایک کے دو بنالوں، اور بہت دنوں بعد یہ معجزہ ظاہر ہوا،

میں اپنی پرانی جلد سے باہر نکلا اس حالت میں کہ ایک دوسرا سناپ

مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اور اب پیدا کرنے کے لئے وہ تصور میں

دو خواہشیں میں دو ارادے ہیں۔

خدا خواہش کرنا، تصور کرنا۔ ارادہ کرنا پیدا کرنا۔ یہ تو بہت طویل

داستان ہے مجھے اس کے لئے کوئی ایک لفظ تھا۔ تو تو الفاظ

کا ماہر ہے۔

سناپ

جننا اس سے دونوں مراد ہیں۔ تصور سے ابتدا کرنا اور پیدائش پر

سناپ

ہاں تا وقتیکہ تم دوسرا آدم نہ پیدا کر لو۔

حوا

مجھے اس کا تو خیال ہی نہ تھا۔ تو بڑا ہوشیار ہے۔ لیکن اگر
حوا پیدا کروں تو ممکن ہے وہ اس کی طرف مائل ہو جائے، اور
رو سکے، میں کوئی حوا نہیں پیدا کروں گی صرف آدم ہی آدم
کروں گی۔

سناپ

بغیر حوا کے آدم اپنی زندگی کی تجدید نہ کر سکیں گے، کبھی کبھی
کے بچے کی طرح مر جاؤ گی اور پھر نئے آدم بغیر حوا کے
سے معذور ہوں گے، تم ایسے انجام کا تصور تو کر چکی ہو
اس کی خواہش نہیں کر سکتی اس لئے ارادہ نہیں کر سکتی
صرف آدم ہی آدم پیدا نہیں کر سکتیں۔

حوا

اگر ہرن کے بچے کی طرح مجھ کو مر جانا ہے، تو جو کچھ باقی ہے
کیوں نہ مر جائے؟ مجھے اس کی فکر نہیں۔

سناپ

زندگی کو رکنا نہیں چاہیے یہ سب سے پہلی بات ہے۔ یہ کتنا
ہے کہ تم کو فکر نہیں، تم کو ضرور فکر ہے۔ یہی فکر ہے جو تمہارے
تصور کو، ابھارے گی، تمہارے خواہشوں کو بڑھائے گی۔

حوا

ارادے کو اٹل بنائے گی، اور آخر کار محض عدم سے پیدا
(سوچتے ہوئے) محض عدم جیسی تو کوئی چیز نہیں ہو سکتی
ہو اب خالی نہیں ہے۔

سناپ

میں نے اس پر نہیں غور کیا تھا یہ ایک زبردست خیال ہے نہ
محض عدم جیسی کوئی چیز نہیں، البتہ ایسی چیزیں ہیں جو
دیکھتے نہیں، گر گٹا بھی ہوا کہا تا ہے۔

حوا

میں نے ایک اور بات سوچی ہے، میں اس کو آدم سے کوئی
(آواز دیتے ہوئے) آدم، آد! آو!

آدم کی آواز۔

او! او!

ختم کر دینا۔

مجھ کو اس داستان کے لئے کوئی ایک لفظ تاجس کا لٹا نے
نصوڑ کیا اور جس کو تجھ سے خاموش زبان میں بیان کیا، وہی داستان
جو اس قدر عجیب و غریب تھی کہ سچ نہیں ہو سکتی تھی اور پھر بھی سچ
ہو گئی۔

سناپ ایک شعر

لٹا میری کون تھی۔ اب اس کے لئے کوئی لفظ بتا۔
وہ تمہاری ماں تھی۔

حوا

اور آدم کی بھی؟

سناپ

ہاں

حوا

راٹھگر) میں جاتی ہوں اور آدم سے جتنے کے لئے کہتی ہوں۔
(تمہارے لگتا ہے) !!!

سناپ

پریشان ہو کر اور چونک کر کیسی نفرت انگیز آواز ہے! تجھ کو ہو
کیا گیا ہے؟ اس سے پہلے کسی کے منہ سے ایسی آواز نہیں نکلی

حوا

آدم نہیں جن سکتا

سناپ

کیوں؟

حوا

لٹا اس کو ایسا تصور نہیں کیا۔ وہ تصور کر سکتا، خواہش کر سکتا،
ارادہ کر سکتا۔ وہ اپنی زندگی کو سمیٹ کر ایک ہر چشمہ تخلیق کے لئے
محفوظ رکھ سکتا ہے وہ سب کچھ پیدا کر سکتا ہے، بجز ایک چیز کے

سناپ

اور وہ ایک چیز اس کی اپنی جنس ہے۔

حوا

لٹا نے اس کو محروم کیوں رکھا؟

سناپ

اس لئے کہ اگر وہ ایسا کر سکتا تو اس کو حوا کی ضرورت نہ ہوتی۔
ٹھیک ہے تو جننا مجھ کو ہو گا۔

حوا

ہاں، اسی ذریعہ سے وہ تم سے وابستہ ہے۔

اور میں اس سے!

اس سے وہ خوش ہوگا اور اس کی افسردگی کے دور دل کا علاج ہو جائیگا۔

اس سے بھی کچھ نہ کہو، میں نے تم کو زبردست راز نہیں بتایا ہے۔ اب اور کیا بتانا ہے؟ یہ معجزہ میرا کام ہے۔

نہیں اس کو بھی خواہش اور ارادہ کرنا ہے، مگر اس کو اپنی خواہش اور ارادہ تم کو دیدینا ہوگا۔

یہ ہے۔

سناپ: کیا تو بڑا راز ہے۔ چپ! وہ آرہا ہے۔
رواں: واپس ہوتے ہوئے، کیا بلوغ میں ہماری آواز اور اس آواز کے علاوہ کوئی اور آواز بھی ہے؟ میں نے ایک نئی آواز سنی تھی۔

خوا: (اٹھتی ہے اور دوڑ کر اس کے پاس جاتی ہے) زرا سوچو آدم! ہمارے سانپ نے ہماری باتیں سن سن کر بولنا سیکھ لیا ہے۔

سناپ: (خوش ہو کر) واقعی؟ (وہ اس کے قریب سے ہو کر تھیر کے پاس جاتا ہے اور سانپ کو پیار کرتا ہے)

آدم: (پیار سے جواب دیتا ہے) ہاں واقعی پیار آدم۔
سناپ: مجھ کو اس سے بھی زیادہ حیرت ناک باتیں کہنی ہیں آدم اب ہم کو ہمیشہ

رہنے کی ضرورت نہیں۔
خوا: (جوش میں سانپ کا سر جھوڑ دیتا ہے) کیا! خوا اس معاملہ میں مجھ کو

سناپ: کھیل نہ کرو۔ کاش کسی روز خاتمہ ہو جاتا، اور اس طرح کہ گویا نہیں ہوا۔ کاش میں ہمیشہ رہنے کی مصیبت سے نجات پاتا۔ کاش

سناپ: اس بلوغ کی پرداخت کسی دوسرے مالی کے سپرد ہو جاتی اور جو نگہبان اس آواز کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے وہ آزاد ہو جاتا

خوا: کاش خواب اور سکون جو روزانہ مجھ کو سب کچھ برداشت کرنے کے قابل بنائے ہوئے ہیں ایک مدت میں دائمی خواب اور سکون

ہو جاتے۔ بس کسی نہ کسی صورت سے خاتمہ ہونا چاہیے۔ مجھ میں اتنی

طاقت نہیں کہ دوام کو برداشت کر سکوں۔

سناپ: تم کو آئندہ گرمی تک بھی رہنے کی ضرورت نہیں۔ اور پھر بھی کوئی خاتمہ نہیں ہوگا۔

آدم: یہ نہیں ہو سکتا۔

سناپ: ہو سکتا ہے۔

خوا: اور ہوگا۔

سناپ: ہو چکا ہے۔ مجھ کو مارڈالو اور کل بلوغ میں تم دوسرا سانپ دیکھو گے تمہارے ہاتھوں میں قہنی انگلیاں ہیں ان سے بھی زیادہ سناپ

تم کو ملیں گے۔

خوا: میں دوسرے آدم اور خوا پیدا کروں گی۔

آدم: میں نے کہا کہ قصہ نہ گڑھو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

سناپ: مجھے یاد ہے جب تم خود ایک ایسی چیز تھے جو نہیں ہو سکتی تھی، مگر پھر بھی تم ہو۔

آدم: (متعجب ہو کر) یہ تو پرست ہوگا (پھر پرٹھو جاتا ہے)

سناپ: میں اس راز کو حواس کھدوں گا، اور وہ تم کو بتا دیگی۔

آدم: (جلدی سے سانپ کی طرف مڑتا ہے اور اس حالت میں سکی پالوں کی تیز خیر پر پڑ جاتا ہے) اٹ!

خوا: کیا ہوا؟

آدم: کانٹا ہے، ہر جگہ کانٹے ہیں۔ بلوغ کو خوشگوار بنانے کے لئے ان کو ہمیشہ صاف کرتے کرتے تھک گیا۔

سناپ: کانٹے جلد نہیں بڑھتے ابھی ایک ٹرت تک بلوغ ان سے بہنیں سکے گا۔ اس وقت تک نہیں بہکتا جب تک کہ تم اپنا بوجھ اتار کر

ہمیشہ کیلئے سونے نہ چلے جانا تم اس کے واسطے کیوں پریشان ہوئے آدم کو اپنے لئے اپنی جگہ خود صاف کرنے دو۔

آدم: یہ ٹھیک ہے تو اپنا راز ہم کو بتا دے۔ دیکھو خوا ہمیشہ کے لئے

آدم	ٹہلنے میں بڑا خطرہ ہے۔	آدم	اگر رہنا نہ پڑے تو کیسا اچھا ہو۔
حوّا	کیا خطرہ؟	حوّا	(بچپنی کے ساتھ زمین پر بھیکر لگا س اکھاڑتے ہوئے) مرد کی یہی حالت ہے، یہ معلوم کرتے ہی کہ ہم کو ہمیشہ کے لئے نہیں رہنا ہے اس طرح باتیں کرنے لگے، گویا آج ہی ہمارا خاتمہ ہو نوالا ہے، تم کو ان خطرناک چیزوں کو صاف کرنا ہے نہیں تو جب کہی بے خبری میں ہم قدم اٹھائیں گے تو گھائل ہو جائیں گے۔
آدم	اگر موت کو کل پٹال دوں تو میں کہی نہیں مرد لگا "کل" کوئی دن نہیں اور نہ ہو سکتا ہے	آدم	ہاں صاف تو ضرور کرنا ہے لیکن توڑا ہی کل میں ان سب کو صاف کر ڈالو لگا۔
سناپ	میں بڑا عقلمند ہوں، مگر انسان سوچنے میں مجھ سے بھی زیادہ گرا ہے، عورت جانتی ہے کہ "محض عدم" کوئی چیز نہیں۔ مرد جانتا ہے کہ "کل" کوئی دن نہیں، میں۔ میں ان کو پوچھتا ہوں، بجا کرتا ہوں	سناپ	(حقہ لگاتا ہے) !!!
آدم	اگر موت کو پانا ہے تو مجھ کو کوئی اصلی دن مقرر کرنا چاہیے کل نہیں۔ مجھ کو کب مرنا چاہیے۔	آدم	یہ عجیب شور ہے، مجھ کو بہلا معلوم ہوتا ہے۔
حوّا	جب میں دوسرا آدم پیدا کروں تو تم مر جانا، مگر نہیں تمہارا جب جی چاہے مر جاؤ، وہ اٹھتی ہے اور آدم کے پیچھے سے بے پردائی کے ساتھ ٹھٹھکتی ہوئی درخت کے پاس جاتی ہے اور اس کے سہارے کٹری ہو کر سانپ کے حلقوں کو قہقہہ دیتی ہے۔	حوّا	مجھ کو نہیں بہلا معلوم ہوتا۔ تو یہ شور پر کس لئے کرتا ہے؟
آدم	پھر یہی کوئی جلدی نہیں ہے	سناپ	آدم نے ایک نئی چیز ایجاد کی ہے یعنی "کل" اب جبکہ بقا کا بوجھ تمہارے سر سے اٹھ گیا ہے تم روز نئی چیزیں ایجاد کرو گے۔
حوّا	معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کو کل پڑا لو گے۔	آدم	بقا؟ یہ کیا ہے؟
آدم	اور تم؟ کیا تم دوسری حوا پیدا کرتے ہی مر جاؤ گی۔	سناپ	یہ میرا لفظ ہے جس سے مراد ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا ہے۔
حوّا	میں کیوں مردوں؟ کیا تم مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو؟ ابھی تم چاہتے تھے کہ میں ساکت بیٹھی رہوں اور چلانے کروں تاکہ کہیں ہرن کے بچہ کی طرح ٹھوکر کھا کر مر نہ جاؤں۔ اور اب تم کو میری کوئی پروا نہیں۔	حوّا	سانپ نے "ہونے" کے لئے ایک خوبصورت لفظ بنایا ہے "زندگی"۔
آدم	اب اس میں اتنا ہرج نہیں ہے۔	آدم	میرے لئے کوئی ایسا خوبصورت لفظ بنا دے جس سے کل کام کرنا مراد ہے، کیونکہ یقیناً یہ ایک زبردست اور متبرک ایجاد ہو
حوّا	(سانپ سے غصہ میں) یہ موت جس کو مانگیں میں سے آیا ہے ایک بلا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں۔	سناپ	ٹھانا
سناپ	(آدم سے) کیا تم چاہتے ہو کہ وہ مر جائے۔	آدم	بڑا پیارا لفظ ہے۔ کاش میں بھی سانپ کی سی زبان پالے ہوتا۔
		سناپ	یہ بھی ہو سکتا ہے ہر بات ممکن ہے۔
		آدم	(ایکایک دہشت میں چونک پڑتا ہے) ارے!
		حوّا	میرا سکون! زندگی سے میری نجات!
		سناپ	"موت" اس کے لئے یہ لفظ ہے۔

آدم نہیں مرنے کا مجھ کو ہے، تو اس کو مجھ سے پہلے نہیں مرنے چاہیے۔ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔

تو آدم دوسری خواہاؤں گے۔

آدم یہ تو ٹھیک ہے، مگر ممکن ہے وہ بالکل تمہاری طرح نہ ہوں، اور ہو نہیں سکتیں، اس کو تو میں خوب محسوس کر رہا ہوں، ان کی وہ یاد گاریں نہ ہوں گی۔ وہ کیا ہوں گی؟ میں ان کے لئے ایک لفظ چاہتا ہوں۔

سناپ اجنبی۔

آدم ہاں یہ ایک اچھا اور ٹھوس لفظ ہے۔ اجنبی۔

تو آدم نے آدم اور سنی خواہاؤں کی تو ہم اجنبیوں کے باغ میں ہونگے ہم کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے (فورا آدم کے پیچھے آجاتی ہے اور اس کے چہرے کو اپنی طرف اٹھاتی ہے) آدم اس بات کو کہی نہ بھولنا۔ ہرگز نہ بھولنا۔

آدم میں کیوں بھولوں گا؟ میں نے تو اس کو سوچا ہے۔

تو آدم نے بھی ایک بات سوچی ہے، ہرن کا بچہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا، اور مر گیا۔ لیکن تم مجھے نے میرے پیچھے آسکتے ہو اور (وہ اچانک اس کے کندھوں کو دھکا دیتی ہے اور اس کو منہ کے بل ڈھکیں دیتی ہے) مجھ کو اس طرح ڈھکیں سکتے ہو کہ میں مر جاؤں، اگر میرے پاس یہ دلیل نہ ہوتی کہ تم میری موت کی کوشش نہیں کرو گے تو میں سوئے کی ہمت نہ کرتی۔

آدم (مارے دہشت کے درخت پر چڑھنے لگتا ہے) تمہاری موت کی کوشش! کیا بھیانک خیال ہے۔

سناپ مار ڈالنا۔ مار ڈالنا۔ مار ڈالنا۔ یہ لفظ ہے۔

تو آدم نے آدم و خواہاؤں کو مار ڈالیں گے۔ میں ان کو نہیں پیدا کروں گی (وہ چٹان پر بیٹھ جاتی ہے۔ آدم کو نیچے کھینچ کر اپنی نفل میں لیتی

ہے، اور اپنے دانتے ہاتھ سے اس کو پکڑے رہتی ہے) تم کو پیدا کرنا ہو گا۔ کیونکہ اگر نہیں پیدا کر دوں گی تو خاتمہ ہو جائیگا نہیں وہ ہم کو مار ڈالیں گے، وہ ہماری طرح محسوس کرنے کی کوئی چیز اس کو روکے گی۔ باغ کی آواز، جس طرح ہم کو بتاتی ہے اسی طرح ان کو بھی بتائے گی کہ مار ڈالنا نہیں چاہیے۔ باغ کی آواز، تمہاری اپنی آواز ہے۔

آدم ہے یہی اور نہیں یہی وہ مجھ سے بڑی ہے میں اس کا ایک جز ہوں۔

تو آدم نے باغ کی "آواز" مجھے تو تم کو مار ڈالنے سے نہیں روکتی، تاہم میں یہ نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے پہلے مرد۔ اس احساس کے لئے مجھ کو کسی آواز کی ضرورت نہیں۔

آدم (اس کی گردن میں باہیں ڈال کر اور متاثر ہو کر) نہیں نہیں بغیر کسی آواز کے بھی یہ ایک کہلی ہوئی بات ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہے جو ہم کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ جس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔

سناپ محبت۔ محبت۔ محبت۔

آدم یہ تو ایک اتنی بڑی چیز کے لئے بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔

سناپ (تمہارے لگتا ہے) !!!

تو آدم نے (بے صبری سے سناپ کی طرف مڑ کر) پھر وہی دلخراش آواز! اس کو بند کر۔ تو کیوں ایسا کرتا ہے؟

سناپ ممکن ہے عنقریب محبت ایک نہایت چھوٹی چیز کے لئے بہت بڑا لفظ ہو جائے مگر جب تک یہ چھوٹا ہے اس وقت تک بہت شیریں ہو گا

آدم (غور کرتے ہوئے) تو مجھے حیران کر رہا ہے۔ میری پرانی مصیبت اگرچہ بھاری تھی مگر سیدھی سادی تھی۔

سناپ	مستقبل کو اپنے ارادے سے باندھ لو اور ایک عہد کر لو۔
آدم	عہد کیا ہے؟
سناپ	اپنی موت کے لئے ایک دن مقرر کرو۔ اور اس دن مرجانے کا ارادہ کر لو۔ پھر موت مشتبہ نہ رہے گی بلکہ یقینی ہو جائیگی۔ پھر خواہ ارادہ کر لے کہ وہ تمہارے مرنے تک تم سے محبت کرے گی اس طرح محبت مشتبہ نہیں رہے گی۔
آدم	ہاں یہ تو بڑی اچھی بات ہے اس سے مستقبل بند ہو جائیگا۔
خوا	دنا خوش ہو کر اور سانپ کی طرف سے منہ پھیر کر، لیکن اس سے امید برباد ہو جائے گی۔
آدم	(غصہ سے) چپ رہو، امید بڑی چیز ہے۔ سرت بڑی چیز ہے یقین مبارک چیز ہے۔
سناپ	”بری“ کس کو کہتے ہیں؟ تم نے ایک نیا لفظ نکالا ہے۔
آدم	جس چیز سے میں ڈرتا ہوں وہ بری ہے۔ اچھا خواہ اسنو اور سانپ تو بھی سچ۔ تاکہ تم دونوں میرے عہد کو یاد رکھو۔ میں چاروں موسم کے ایک ہزار دوڑ تک زندہ رہوں گا۔
سناپ	سال، سال۔
آدم	میں ایک ہزار سال تک زندہ رہوں گا، اس کے بعد نہیں رہوں گا میں مر جاؤں گا اور سکون حاصل کروں گا، اور اس وقت تک خواہ سو کسی دوسری عورت کی محبت نہیں کروں گا۔
خوا	اور اگر آدم اپنے عہد پر قائم رہے گا تو میں بھی اس کے مرنے تک کسی دوسرے مرد کی محبت نہیں کروں گی۔
سناپ	تم دونوں نے نکاح ایجاد کیا ہے آدم تمہارا شوہر ہے جو کسی دوسری عورت کے لئے نہیں ہو سکتا اور تم اس کی بیوی ہو جو کسی دوسرے مرد کے لئے نہیں ہو سکتی۔
آدم	(قدرتِ خواہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) شوہر اور بیوی۔
سناپ	جن عجیب و غریب چیزوں کا تو وعدہ کر رہا ہے وہ مجھے موت جیسی نعمت دینے سے پہلے میری ہستی کو اٹھا سکتی ہیں میں ابدی زندگی کے بوجھ سے پریشان تھا۔ مگر میرا دل پر اگندہ نہیں تھا۔ اگر مجھ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں خواہ کی محبت کرتا ہوں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ممکن ہے وہ میری محبت چھوڑ دے اور کسی دوسرے آدم کی محبت کرنے لگے۔ کیا تو اس علم کے لئے کوئی نفاذ بنا سکتا ہے؟
سناپ	رُشک، رُشک، رُشک!
آدم	کیسا بھیانک لفظ ہے!
خوا	(آدم کو ہلاتے ہوئے) بہت سوچنا نہیں چاہیے، تم بہت سوچا کرتے ہو
آدم	(غصہ میں) میں سوچنے سے باز کیے رہ سکتا ہوں، جبکہ مستقبل مشتبہ ہو گیا ہے۔ اشتباہ سے ہر چیز ہتر ہے، زندگی مشتبہ ہو گئی ہے، محبت مشتبہ ہے۔ کیا اس تازہ مصیبت کے لئے تیرے پاس کوئی نفاذ ہے؟
سناپ	خوف، خوف، خوف۔
آدم	اس کا علاج بھی تیرے پاس ہے؟
سناپ	امید، امید، امید۔
آدم	امید کیا ہے؟
سناپ	جب تک تم کو مستقبل کا علم نہیں، تم کو یہ علم بھی نہیں کہ مستقبل بھی سے زیادہ خوشگوار نہیں ہوگا، اسی کو امید کہتے ہیں۔
آدم	اس سے مجھے تسکین نہیں ہوتی۔ میرے اندر خوف بہ نسبت امید کے زیادہ قوی ہے مجھے یقین کی ضرورت ہے (دھمکتا ہوا اٹھتا ہے) یہ چیز مجھے دے ورنہ پھر جب تجھ کو سوتا ہوا پاؤں گا تو مار ڈالوں گا
خوا	(سانپ کے گرد اپنی باہیں ڈال کر) میرا خوبصورت سانپ۔ اے نہیں یہ خوفناک خیال تمہارے دل میں سے آ سکتا ہے۔
آدم	خوف مجھ سے ہر کام کر سکتا ہے، سانپ ہی نے مجھ کو خوف دیا اب اس کو کہہ دو کہ مجھ کو یقین دے ورنہ میری طرف سے خوف لیکر جائے۔

حوا (اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے رہی تھی) بیوی اور شوہر
سانپ (قہقہہ لگا رہا ہے) !!!

حوا (آدم سے اپنے کو علیحدہ کر کے) میں نے کہا کہ یہ منحوس شور نہ کر
آدم اس کی بات نہ سن۔ شور بجھے پسند ہے، اس سے میرا دل ہلکا
ہوتا ہے، تو بڑا خوش دل سانپ ہے، لیکن تو نے ابھی کوئی عہد
نہیں کیا۔ تو کیا عہد کرتا ہے؟

سانپ میں کوئی عہد نہیں کرتا۔ میں اتفاق سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔
آدم اتفاق؟ اس کے کیا معنی؟

سانپ اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھ کو یقین سے اتنا ہی خوف ہے، جتنا تمکو
اشتبہ سے، یعنی سوائے اشتباہ کے کوئی چیز یقینی نہیں، اگر
میں مستقبل کو باندھ لوں تو اپنے ارادہ کو باندھ لوں گا۔ اور جب ارادہ
کو باندھ لوں گا، تو پیدائش میں رکاوٹ شروع ہو جائیگی۔

حوا پیدائش میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے، میں نے کہا کہ میں پیدا
کر دوں گی۔ اگر ایسا کرنے میں مجھے اپنے کو پرزے پرزے بھی کر دینا پڑے
آدم تم دونوں چپ رہو میں مستقبل کو ضرور باندھ لوں گا۔ میں خوف سے
ضرور آزاد ہوں گا۔ (حوا سے) ہم اپنا اپنا عہد کر چکے، اگر تم کو پیدا
کرنا ہے تو تم اس عہد کے حدود کے اندر پیدا کرو۔ اب زیادہ سانپ
کی باتیں نہ سنو (حوا کا بال پکڑ کر کھینچتا ہے)

حوا چھوڑا حق! ابھی اس نے مجھ کو اپنا راز نہیں بتایا ہے۔

آدم (اس کو چھوڑ کر) ہاں ٹھیک ہے، احمق کس کو کہتے ہیں؟

حوا میں نہیں جانتی یہ لفظ آپ سے آپ آگیا۔ جب تم بھول جاتے ہو؛
اور سوچنے لگتے ہو اور خوف سے مغلوب ہو جاتے ہو۔ اس وقت

تم جو کچھ ہوتے ہو وہی احمق ہے۔ آدم سانپ کی باتیں نہیں؛

آدم نہیں مجھے خوف معلوم ہوتا ہے جب وہ بولتا ہے تو ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ زمین میرے پاؤں کے تلے مچھ رہی ہے۔ کیا تم

اس کی باتیں سننے کے لئے ٹھیردگی؟

سانپ (قہقہہ لگا رہا ہے) !!!

آدم (شگفتہ ہو کر) اس آواز سے خوف دور ہو جاتا ہے، کیا تم شام

سانپ اور عورت آپس میں راز کی باتیں کرنے جا رہے ہیں۔

(منہ تپتا ہے اور آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے یہ اس کی پہلی منہ تپتی)

حوا اب راز بتا راز؛ (چٹان پر بیٹھ جاتی ہے اور سانپ کے گلے میں

باہیں ڈال دیتی ہے سانپ زیر لب کچھ کہنا شروع کرتا ہے) حوا کا

چہرہ انتہائی دلچسپی سے چلنے لگتا ہے، اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی

ہے یہاں تک کہ پھر اس کی جگہ انتہائی نفرت کی علامتیں نمودار

ہو جاتی ہیں اور وہ اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔
باقی ————— باقی

مجھ کو لکھی ہوئی

چھ روپیہ بذریعہ
منی آرڈر پہلے روانہ
کردینگے تو یہ کتابیں
مع محصول آپ کو
چھ روپیہ میں ہی
بھیج دی جائیں گی



اگر علیحدہ علیحدہ یا سہ
بذریعہ وی پی پی
کتابیں منگائی جائیں گی
تو علاوہ محصول مع
میں روانہ کی جائیگی
اور اگر آپ صرف

اورنگ آباد اور اس کا نواح

اورنگ آباد، تعلقہ، ضلع، اور صوبہ، کا مستقر ہے این جی ایس ریلوے (چھٹی لین) پر واقع ہے خطوط ۲۱۴ شمالی و ۷۵.۷۵ شرقی کے تقاطع پر کوم (قام) ندی کے کنارہ پر آباد ہے۔ بلحاظ وقعت تاریخی اور وسعت سلطنت اکھنڈ کا دوسرا شہر ہے، سنہ ۱۶۵۷ء میں ملک عنبر وزیر سلطنت نظام شاہ بہادر نے اس شہر کی بنیاد رکھ کر کے قریب ڈاکٹر اسکو "فتح نگر" سے موسوم کیا، سترہویں صدی کی ابتدا میں نظام شاہی فوج بہ مائتھی ملک عنبر مغلوں سے لڑتی رہی سنہ ۱۶۵۷ء میں ملک عنبر کا انتقال ہو گیا اور نظام شاہی قوت گھٹنے لگی حتیٰ کہ سنہ ۱۶۵۷ء میں مالک محروسہ نظام شاہی عنیمہ سلطنت دہلی قرار پایا سنہ ۱۶۵۷ء میں صوبہ داری دکن پر اورنگ زیب کا تقرر ہوا، اور کلور سنہ ۱۶۵۷ء صوبہ دار ہوئے کٹر کی میں قیام کے وقت اس کا نام بدل کر اورنگ آباد سے موسوم کیا، اورنگ زیب یہیں بیٹھ کر مرہٹوں، شاہان گولکنڈہ وغیرہ سے چھڑ چھاڑ شروع کی، سنہ ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں کو تخت سے اتار کر دکن کا رخ کیا اور مراٹھوں سے لڑائی شروع کی سنہ ۱۶۵۷ء میں احمد نگر میں انتقال کیا اور طوائف الملوکی شروع ہوئی، اسی زمانہ میں نظام الملک آصف جاہ بہادر اول نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور صوبجات دکن پر قابض ہو کر حیدر آباد کو پایہ تخت قرار دیا۔

شہر اورنگ آباد کے شمال و جنوب کو سبل اور سانا پھاڑوں کے سلسلہ نے محدود کر دیا ہے، کہتے ہیں کہ اس کی مردم شماری دو لاکھ نفوس ہو گئی اور موجودہ دیرانوں اور کھنڈروں سے آبادی کی شہادت ملتی ہے جدید شہر پرانے اورنگ آباد کے مشرق میں واقع ہے، اور چھاؤنی مغرب کی طرف ندی کے اُس پار ہے سنہ ۱۶۵۷ء میں کنٹن جنٹ اور عربوں میں ایک مختصر سی جھڑپ ہو گئی سنہ ۱۶۵۷ء میں ہی ایسا ہی ارادہ تھا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اورنگ آباد کی سطح آراضی نہایت ہی ناموار ہے، آبادی تسطیل ہے، آبادی کا طول ۱۲ ۱/۲ اور عرض ۱۲ ۱/۲ میل ہے اور دور (۸) میل ہے شہر نہایت ہی مضبوط اور سنگ بستہ ہے جا بجا مورچے، بروج بنے ہوئے ہیں تفصیل کی بلندی (۱۲) فٹ اور بعض جگہ اس سے زیادہ ہے۔ تفصیل میں تفنگ اندازی کے جہز کے بنے ہوئے ہیں اور توپیں بھی چڑھی ہوئی ہیں۔ چار بڑے دروازے (جالنہ دروازہ، پٹن دروازہ، مکہ بامکائی دروازہ، دہلی دروازہ، بنیں اور بعض دروازے کھلے یا بند موجود ہیں، اس طرح تیرہ دروازے اور متعدد کھڑکیاں اطراف میں ۵۴ محلے آباد تھے جن میں سے اب صرف بیگم پورہ میں بعض مکانات نظر آتے ہیں باقی کھنڈر ہیں؛

ایک زمانہ میں ۳۸ بازار تھے مگر اب ۱۷-۱۸ کے نام سے جاتے ہیں اب صرف چوک اور شاہ گنج خزاں بچے ہیں اور بقیہ خشت ذوہ تمام شہر ویران پڑا ہے، جدھر دیکھو۔۔۔۔۔ کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں قدیم مکانات نہایت ہی وسیع کسادہ مضبوط اور مستحکم ہیں ہر مکان میں حوض اور نہریا موجود ہیں مکانات کئی کئی منزلیں اور خوش وضع ہیں۔

یہ مسجد اورنگ آباد کے آباد اور پر رونق بازار شاہ گنج میں واقع ہے اور بہترین سجدہ دانی جاتی ہے سنہ ۱۶۵۷ء میں تیار ہوئی ہے
مشاہد گنج
 سید حسن علی خان صوبہ دار دکن نے سنہ ۱۶۵۷ء میں اس مسجد کا حوض بنوایا، نواب عقد الدولہ نے مسجد کی متعلقہ عمارت بنوائی۔

مسجد کی کرسی نہایت ہی بلند اور شاندار ہے، تین طرف دو کائیں بنی ہوئی ہیں سامنے پڑھیاں ہیں، مسجد کے پانچ در اور ۴ ستون ہیں، درمیانی گنبد بلند اور عمدہ ہے مشرق و مغرب میں مسافروں کے قیام کے لئے وسیع دالان بنے ہوئے ہیں مسجد میں گل کاری کی گئی ہے جو بہترین ہے مسافروں کے ٹھرنے کے دالان عام خاص کھلتے ہیں مسجد کی چھت پر چھوٹے چھوٹے لداؤ گنبد ہیں، دونوں جانب دو بلند دروازے پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں پنج میں گھڑیاں نصب ہے۔

مسجد چوک یہ مسجد بھی اورنگ آباد کے وسیع اور دلکش بازار چوک میں واقع ہے اسے اورنگ زیب کے چچا شائستہ خاں نے ۱۶۱۵ء میں بنوایا تھا۔ بیرونی رخ پر پانچ اور اندر دو مینار ہیں آٹھ مستون نگین ہیں چھت پر پانچ گنبد ہیں جن میں بیچ کا گنبد بڑا ہے۔ جس پر کس بھی چڑھا ہوا ہے، دونوں جانب بڑے بڑے مینار ہیں صحن میں حوض ہے دروازہ شاندار ہے جس پر چھوٹے چھوٹے دو مینار بھی ہیں نیچے ایک طرف دو کائیں ہیں اور دروازہ کے دونوں بازو دو حجرے مسافروں کے ٹھرنے کے لئے تھے مگر یوں کی برفراجی سے بہت ہی کم مسافر ٹھرتے ہیں، اندر دو مسجد ۴۴ شعر و پوار پر کندہ ہیں یہ کتبہ میرزا محمد ابن محمد شریعت مینی کا منظوم کردہ ہے ۲

مسجد از لطف الہی شد تمام

میں تاریخ تعمیر ۱۰۲۸ھ نکالی ہے۔ بیرون مسجد انہیں مینی بزرگوار کے ۱۱ شعر کندہ ہیں ۲

بہیں دلکش جائے حاجت روائی

میں تاریخ ۱۰۲۸ھ نکالی ہے، مینی صاحب کے شعر ہی ایسے ہی ہیں جیسا کہ مادہ تاریخ جائے حاجت روائی کی حدت ملاحظہ ہو یہ مسجد کی تاریخ ہندو کتبوں کا خط بہت بھدا اور تھمر معمولی ہے دروازہ پر ایک شعر اسی خط میں معمولی تھمر پر کندہ ہے ۵

مسجد شایستہ شایستہ خاں

ساخت بیک سال محمد شریف

اسی مسجد میں نواب سعادت جنگ بہادر صدر ناظم مال سمت مراٹھواری (صوبہ دار اورنگ آباد) نے مدرسہ حفاظ قائم فرمایا ہے۔ جس میں بارہ پندرہ لڑکے کلام مجید حفظ کرتے ہیں۔

مسجد عالمگیری یہ مسجد حاجی قاسم کی مسجد کہلاتی ہے انگوری باغ کے پاس ایک مختصر سی مسجد ہے۔ جسے ۱۹۶۱ء میں عالمگیر نے بنوایا تھا ایک کتبہ بھی نصب ہے جس سے سن تعمیر کا پتہ چلتا ہے۔

کالی مسجد ملک عنبر نے نگہ سیاہ کی سات مسجدیں بنوائی تھیں جو کالی مسجد کہلاتی ہیں منجملہ ان کے ایک جو ناما زار کی کالی مسجد ہے جو سن ۱۰۲۸ھ میں تعمیر ہوئی ہے جو ایک بلند چوڑے پر واقع ہے اور پانچ درہی ہے۔

جامع مسجد یہ بہترین اور عمدہ مسجد ہے اس میں پانچ قطاروں میں چالیس ستون ہیں جو مسجد کو ۲۴ قطعات میں تقسیم کرتے ہیں، ہر ایک پر برجیاں بنی ہوئی ہیں، یہ مسجد ملک عنبر نے بنوائی تھی، مگر اورنگ زیب نے ۱۰۲۸ھ میں مکمل کرایا، کرسی بلند ہے جس کے نیچے برکیٹ لگے ہوئے ہیں پردے کی دیوار مشابک ہے وضع قطع نہایت ہی عمدہ ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے، سامنے وسیع صحن

تین حجے مسافروں کے لئے ہیں وسط صحن میں حوض ہے۔

لال مسجد | یہ مسجد اورنگ زیب میں مفتی زین العابدین نے ۱۶۷۱ء میں بنوائی ہے، تمام مسجد میں سرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔
استرکاری بہترین اور عمدہ ہے۔

درگاہ شاہ مسافر | محمود دروازہ کے پاس آپ کی درگاہ باغ کے اندر واقع ہے۔ اورنگ زیب آپ کا بہت معتقد تھا، آپ نے ۱۶۷۱ء میں انتقال کیا، ایک مدرسہ، مسجد، کچری، ایوان، سرلے، اور چند عمارات درگاہ ہی کے متعلق ہیں

ان عمارات میں ننگ سرنج کا استعمال کیا گیا ہے، تمام ستون ننگ سرنج کے ہیں شاہ صاحب کا فرار بھی ننگ سرنج کا ہے کئی ایک تختہ حوضی اور فوارے ہیں، باہر ایک بڑا حوض ہے جس میں نہر کا پانی آتا ہے جو بہت بلندی سے چادر کی طرح حوض میں گرتا ہے اور اسی پانی کی ایک نالی سیدھی جانب گر کر پن چلی بھی حرکت دیتی ہے، اب تو پن چلی ٹوٹ گئی ہے۔ اس درگاہ کی ترمیم چین قلیج خاں کے کسی بھراہی امیر نے کی تھی۔ پنچکی کے پاس کا بڑا حوض ۱۶۷۹ء کے بعد بنا ہے، اورنگ آباد میں یہی ایک پر فضا جگہ ہے اندر ایک مسجد بھی بہترین اور عمدہ ہے جس کے پیچھے درگاہ ہے، سامنے بنی خانہ وغیرہ ہے جہاں ایک ”درہ“ رکھا ہوا ہے یہ درہ سیلاپے کی وضع کا چمڑہ کا ٹکڑا ہے جس میں لکڑی کا دستہ لگا ہوا ہے یہی وہ شرعی درہ ہے جس نے عالمگیر کا نام اب تک روز روشن کی طرح مشہور کر رکھا ہے۔

پنچکی سے تھوڑے فاصلہ پر لب ٹرک خان بہادر مبارک علی خاں مرحوم ہتم کو توالی سرکار عالی اور ان کی صاحبزادی ایک چوکھنڈی میں مدفون ہیں۔ جن کے پہلو میں نور محمد صاحب دوم تعلقہ دار کا فرار ہے، یہ درگاہ پن چکی کی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ سنا ہے کہ درگاہ کے متعلق ایک عظیم اٹان کتب خانہ بھی تھا جو ضائع ہو گیا؛

بارہ دری | دہلی دروازہ کے متصل دھڑی محل اور بارہ دری واقع ہے یہ بارہ دری عقد الدولہ کی بنائی ہوئی ہے۔ جس میں اب سرکاری دفاتر ہیں اس کے متعلق ایک بلغ بھی ہے جس میں متعدد حوض اور فوارے وغیرہ ہیں۔

دھڑی محل | بارہ دری کی تیاری کے وقت مزدوروں سے فی مزدور ایک ایک دھڑی لے کر جمع کی گئی اور اس سے یہ محل بنایا گیا ہے، یہ ایک چھوٹا سا پانچ درہ مکان ہے۔

آئینہ خانہ | یہ ایک وسیع مکان ہے جس میں اس وقت دفتر ہے۔

محل نوکھنڈہ | یہ محل ایک بلند ٹیکری پر واقع ہے جسے ملک عنبر نے ۱۶۷۱ء میں بنوایا تھا ہر کل کا مشہور دروازہ اس محل کا صدر دروازہ ہے ملک عنبر کے زمانہ میں دروازہ ہر کل نقار خانہ کا کام دیتا تھا۔

محل نوکھنڈہ کی عمارت میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی ہیں عالم علی خاں نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور آصف جاہ بہادر نے بھی اس میں توسیع کی ان کے بعد ناصر خاں بہادر نے اکثر عمارات وغیرہ بنوائیں، اور نواب نظام علی خاں بہادر نے جبکہ وہ اس میں تشریف رکھتے تھے بہت ساری تبدیلیاں کیں یہ کہنا مشکل ہے کہ کونسی عمارت کس نے بنائی۔

اس میں پانچ زمانے محلات، دیوان عام، دیوان خاص، مسجد وغیرہ میں ہر ایک کے کئے خانہ بانچ اور اس میں متعدد محوض ہیں، دیوان خانہ اور حمام بھی علیحدہ ہیں، دیوان عام کے سامنے ایک کچری ہے جس میں سند حضور بندگان عالی رکھی ہوئی ہے، جو عیدین میں بچائی جاتی ہے اور شاہانہ ترک و احتشام سے عمدہ داران مستقر سند کے سامنے نذر پیش کرتے ہیں۔

درگاہ نوکھڑے کے پاس ہی سید شاہ تاج الدین جموی (المتوفی ۱۰۸۸ھ) اور سید شاہ سلیمان بغدادی (المتوفی ۱۰۸۸ھ) سید شاہ عونیہ بادشاہ (المتوفی ۱۰۸۹ھ) چین بگم صاحبہ بنت نواب آصف جاہ (المتوفی ۱۰۸۹ھ) کے مزار ہیں۔

گنبد پیر اسماعیل ہر رسول کی طرح پر دہلی دروازہ کے باہر عالمگیر کے استاد پیر اسماعیل صاحب کا گنبد اور بانچ ہے۔ بانچ کا دروازہ عمدہ اور شاندار ہے۔ جس کا محراب اونچا اور ڈیوڑھی نما ہے، دیواروں پر نقش و نگار ہیں، کونوں پر بیج بنے ہوئے ہیں۔

قلعہ آرک اورنگ زیب نے ۱۰۹۲ھ میں قلعہ آرک بنوایا اس کے پانچ دروازے ایک نفاذ خانہ ہے ان عمارات کی ترمیم ہوتی رہتی ہے کیونکہ حضور نظام جب کبھی تشریف لاتے ہیں یہیں تشریف لگتے ہیں معزز مہمان بھی یہیں پر ٹہرتے ہیں۔ اس میں ایک دربار ہال کئی ایک عمارات بانچ وغیرہ موجود ہیں فرنیچر نہایت ہی عمدہ اور بہترین ہے گویا اورنگ آباد کا گورنمنٹ ہاؤس ہے۔

سرے موضع ہر رسول میں اورنگ زیب نے تین سرے بنوائے ہیں جن میں ایک سرے بہت بڑی اور عمدہ ہے جس میں محبس تھا جو تخفیف ہو گیا۔

سنہری محل سنگ پورے کے پہاڑ پر واقع ہے اس کو ایک بندیلے افسر نے بعد عالمگیر بنوایا تھا، یہ عمارت بلند کرسی پر ہے، چونکہ اس کے اندر بعض جگہ طلائی نقش و نگار تھے اس لئے سنہری محل نام مشہور ہو گیا۔ یار لوگوں نے سب کال لیا۔ اب محل ویران ہے اب اس میں گھاس بھری ہوئی ہے۔

چٹیا خانہ یہ چٹت خانہ بھی کہلاتا ہے۔ ملک غنیمت نے پتھروں کے لئے بنوایا تھا، مگر اورنگ زیب نے مسافر خانہ بنادیا اور پھر چٹیا خانہ بن گیا اب اس میں سرکاری دفتر ہے۔

مقبرہ رابعہ دورانی شہزادہ اعظم شاہ نے اپنی والدہ درس بانو رابعہ دورانی محل اورنگ زیب المتوفی ۱۰۸۵ھ کی مزار پر یہ مقبرہ بنوایا ہے اس کی تعمیر ۱۰۸۵ھ میں شروع اور ۱۰۸۶ھ میں ختم ہوئی یہ مقبرہ عطار اللہ کی نگرانی میں بنا ہے، جس کا صرفہ ۶ لاکھ ۱۵ ہزار دو سو تین روپیہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تاج محل کی نقل ہے مگر افسوس ہے کہ اہل سے مناسبت نہیں رکھتا مقبرہ کا احاطہ ۵۰۰ × ۳۰۰ گز ہے اس کی دیوار پختہ اور فصیل نما ہے باہر کی طرف اس میں محراب بھی بنے ہوئے ہیں اکثر جگہ برج اور مینار بھی ہیں، جنوبی دیوار کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت دروازہ ہے جن پر پتیل چڑھا ہوا ہے اور بہترین نقش و نگار سے مزین ہے ہر جانب عظیم الشان بارہ دریاں ہیں جن کے سامنے سے مقبرہ کو ٹھک گئی ہے، مقبرہ کی عمارت مثنیٰ شکل کی ہے، ہر زاویہ پر مینار ہیں سامنے ایک محراب ہے اور آنے کے لئے ایک دروازہ ہے محراب کے دونوں بازو کمانیں ہیں، جن میں سے گیلری کو راستہ جاتا ہے، مقبرہ کا چوڑا ۲۷ فٹ مربع ننگ سرخ کا ہے۔ چاروں طرف ۲۷ فٹ بلند مینار ہیں ہر مینار کے نصف حصے پر گیلری ہے اور اوپر ایک گیلری اور برجیاں ہیں جن پر کلس چڑھے ہوئے ہیں

ہر قسم کے عطر کے لئے اصغر علی محمد علی کو لکھیے۔

یہ مینار مٹن ہیں، اور ادھر چڑھنے کے لئے گول چکر دار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔

مقبرہ ایک مرمر کی بہترین گنبد ہے جس کے چاروں طرف چار محراب اور چار مینار ہیں مقبرے کے اندر جانے کے لئے چوتھے پر سے سیڑھیاں ہیں جو نیچے پہنچاتی ہیں بیچ میں مزار ہے جس پر سنگ مرمر کی جالی ہے اندر محرابوں اور ستونوں پر بے نظیر گلکاری کی گئی ہے، جابجا سنگ مرمر کی جالیاں نصب ہیں جن پر تچے کاری کی گئی ہے، فرش سنگ مرمر کا ہے بعض جگہ اینٹ اور چونہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور استرکاری بہترین موتی کے چونے سے کی گئی ہے۔ فرش پر گلکاری ہے۔

چوتھے کے مغرب میں ایک مسجد ہے جس کے پانچ درہیں اور اندر متعدد ستون مسجد کے دونوں طرف جالیاں ہیں روکار پر بہترین نقش و نگار؟ فرش چونہ کا ہے مگر بہترین چکنا اور چکدار اور نہایت ہی سفید ہے۔ فرش پر سی سیاہ مسالہ کی جا نماز کے نشانات ہیں جو دور سے سنگ مرمر پر سنگ موسیٰ کی بچی کاری نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مقبرہ کے لئے جو سنگ مرمر استعمال ہوا ہے وہ جلیو پوری ہے۔

اعظم باغ مقبرہ کے متصل اعظم شاہ کا ایک ویران باغ ہے جو اعظم باغ کہلاتا تھا، مگر اب وہ انجمن ترقی اُردو کے قبضہ میں ہے، اور اُردو باغ کے نام سے موسوم ہے اس میں ایک افتادہ مکان ہے جس میں انجمن کا پرس وغیرہ ہے، اس کے قریب ایک مکان میں مولانا عبدالحق معتمد انجمن ترقی اُردو رہتے ہیں۔

چھتری موضع ہر سول میں اورنگ زیب کے مشہور افسر فوج راجہ جے سنگ کی بنائی ہوئی چھتری ہے۔ یہ ایک چھتری کی وضع کی بنائی ہوئی عمارت ہے، جس پر مٹن شکل کا گنبد ہے اور ایک اٹھائیس ستونوں کا برآمدہ، جس کے اوپر بہشت پہلو برجیاں بنی ہوئی ہیں یہ راجپوتوں کا دفن ہے۔

پھلری اورنگ آباد سے سولہ میل کے فاصلہ پر ایک بڑا قصبہ ہے جس کے وسط میں ایک مضبوط گڑھ ہے اور مندر وغیرہ ہیں گڑھ تو خیر باقی ہے مگر مندروں کے پتھر مسلمانوں کے کام آئے ایک دیول پر سنکرت کتبہ ہے جس سے سنہ تعمیر ۱۲۲۳ء معلوم ہوتا ہے۔

ستارا اورنگ آباد سے جانب جنوب تین میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے اس کی ایک گڑھ ہے اب بالکل افتادہ اور ویران پڑی ہوئی ہے اس میں ایک بڑا مندر ہے جس کی جاترا بڑے دھوم سے ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ قصبہ مشہور بھی ہے۔

مزارِ سراج سراج اورنگ آبادی مشہور شاعر گزے ہیں اب اورنگ آباد ہی کے باشندے اور صاحب دل شاعر تھے آپ کا خراج قلعہ ارک کے قریب کس مہر سی کے عالم میں پڑا ہوا ہے آپ کا دیوان انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شایع ہو چکا ہے۔

ذریع آب اورنگ آباد میں پانی کا بہت آرام ہے ہر چھوٹے بڑے مکان میں حوض موجود ہے جن میں نہر آتی ہے اور ہر مسجد یا چوراسے پر نل ہے۔ اور پانی بہ افراط میسر ہوتا ہے۔ یہ نہرں پہاڑوں پر سے لائی گئی ہیں، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مخزن الماء کہاں سے بنایا گیا ہے، کیونکہ اونچے سے اونچے مقام پر بھی نہر کا پانی پہنچتا ہے، کل ذخیرہ آب چودہ ہیں مگر ان کے مخزن نامعلوم ہیں، نہر بعض جگہ تختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے، اور بعض جگہ گچ کے گول نل بنے ہوئے ہیں بعض جگہ انہیں نلوں پر مینار بنا دیے گئے ہیں جو ہوا پہنچا کر پانی کو صاف رکھنے کے علاوہ روانی آب میں بھی معاون ہوتے ہیں۔

غار ہائے اورنگ آباد

اورنگ آباد سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر جانب شمال ڈیڑھ میل تک ایک غاروں کا سلسلہ چلا گیا ہے، اس میں تین گروپ اور بارہ غار ہیں، پہلا گروپ بدھ کے زمانہ کا ہے اور دوسرا گروپ بھی اسی کے ساتھ کا، مگر تیسرا گروپ اس سے قدیم اور نامکمل ہے۔ پہلے گروپ میں پانچ غار ۳۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔

غار نمبر ۱۔ مغرب کی طرف سے دیکھنے لگیں تو پہلا غار ۴۲ فٹ لمبا لیگا اس کے آگے چار ستون کا برآمدہ ہے، جس کا طول (۷۵) فٹ اور عرض (۹) فٹ ہے، طرز عمارت اجنٹا کے غار نمبر ۱ سے ملتی ہوئی ہے، برآمدے کے پیچھے دیواریں اور تین دروازے دو جہرہ کے ہیں، وسطی دروازہ پر گلکاری کی گئی ہے اور چوکھٹ پر زمانے اور مردانے مجسمے ہیں، کٹرکیاں بھی نقش و نگار سے پر ہیں، مغرب میں بدھ کنول کے پھول پر بیٹھا ہے جس کے دونوں طرف آدمی مورچیل لئے کھڑے ہیں، کنول کو پانچ ناگ بھنوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، مغربی سمت میں برہمنوں کی ایک قطار ہے۔

غار نمبر ۲۔ اس کے سامنے کا حصہ گرا ہوا ہے، ایک برآمدہ دو ستونوں پر قائم ہے، اندرونی حصہ ۲۱ x ۹ فٹ ہے اور اس کے اطراف چار فٹ چوڑا پر اوکشتا ہے۔ ردکار کا مندر ۱۴ فٹ بلند ہے جس کے دونوں بازوؤں پر دو دریاں کنول کے پھول پر کھڑے ہیں ان کے ساتھ دیا دہر اور پانچ بھن کے ناگ ہیں بائیں طرف پدینی کی مورت معمولی لباس میں ہے جس کی پیشانی پر بدھ کی تصویر ایک ہاتھ میں کنول کی چھڑی لئے ہے، دوسرے مجسمہ کی نسبت خیال ہے کہ اندر کا ہوگا، اندر بودہ کی ۹ فٹ اونچی مورت ہے جو کنول کے پھول پر بیٹھی ہے، کندھوں پر دو آدمی کھڑے ہیں۔ یہ تصاویر ایک زمانہ میں رنگین ہوں گی، کیونکہ اب بھی ان پر رنگ کے علامات موجود ہیں۔

غار نمبر ۳۔ یہ دیہارا غار ہے ابتدائی برآمدہ ۳۰ فٹ - ۶ x ۸ فٹ - ۹ ہے اس کے چار ستون ہیں اور دو حجرے پھلی دیوار میں ایک دروازہ اور دو درتھے ہیں ایک ہال ۴۲ فٹ - ۶ x ۴۶ فٹ - ۶ کا ہے اس کے بارہ ستون ہیں جن پر بہترین نقش و نگار ہیں ایک حجرہ سادہ ہے اور دوسرے میں کام کیا گیا ہے۔ چاروں کونوں میں چار حجرے پجاریوں کے لئے بنے ہیں، اندرونی مندر کے ستون نقش ہیں دیوار پر دو عورتوں کی تصویر ہیں، جو ایک درخت کے سایہ میں کھڑی ہیں مندر میں داخل ہونے کے لئے سیڑھیاں ترشی ہوئی ہیں دروازہ بھی منقش ہے۔ دونوں طرف ایک ایک مورت ہے جس کے سر پر ناگ کا پھن سایہ فلن ہے مندر میں بدھ کا ایک بڑا مجسمہ ہے اور سامنے دو قطاروں میں مرد اور عورتیں مل کر کھڑی ہوئی ہیں یہ غار ۸۲ فٹ گہرا ہے اور تریسٹھ فٹ چوڑا ایک طرف جنگ کا مرقع بہترین طریقہ پر دکھایا گیا ہے ایک جانب بدھ پلنگ پر لیٹا نظر آتا ہے غار نمبر ۴۔ یہ ایک چاقسم کا منہدم غار ہے سامنے کا حصہ بالکل ٹوٹ گیا ہے ۳۸ فٹ - ۲۲ x فٹ طول و عرض ہے چھت سادہ اور ستر معمولی ستون ہیں۔ مندر کا حجرہ ۲۳ x ۱۳ فٹ ہے۔

غار نمبر ۵۔ اس کا بھی زیادہ حصہ گر گیا ہے صرف ایک مندر اور پر اوکشتا کی دیواریں باقی ہیں۔ اس میں بدھ شیر کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے اس کا نام پارس ناقص ہے اور غالباً جینیوں کا زمانہ ہے۔ یہاں پہلا گروپ ختم ہوتا ہے۔

غار نمبر ۶۔ یہ غار دوسرے گروپ میں ہے جو پہلے گروپ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے، یہ ایک دیہارا قسم کا غار ہے مگر بعض باتیں چٹائے کی سی بھی پائی جاتی ہیں۔ پنج میں مندر اور اطراف میں حجرے ہیں ایک برآمدہ ۳۸ - ۱ x ۹ فٹ کا ہے جس کے ستون منہدم ہو چکے ہیں بعض حصے میں دو کمرے ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی تصاویر ہیں، مندر میں بدھ کی طویل اور عظیم الشان مورت ہے اور مندر کی دیواریں

اور چھتیں رنگین ہیں یہ بھی اجٹا کے غاروں کی طرز کا عمدہ غار ہے۔

غار نمبر ۷۔ ابتدائی برآمدہ شکستہ ہے البتہ چار ستون منقش قائم ہیں ایک ہال ۳۴×۱۴ فٹ کا ہے جس کے دو مربع ستون عمدہ تراش کے ہیں اندر ایک ہال ۳۸×۳۰ فٹ کا ہے اور اس کے اندر ۱۰ فٹ مربع مندر ہے مندر کے اطراف پر اوکٹناہی برآمدہ کے دونوں طرف دو حجرے ہیں جن میں کئی کئی مورتیں ہیں ان کے علاوہ چھ حجرے سنا سیوں کے لئے رہنے کو ہیں۔ اس کی بعض دیواروں پر بہترین مرقع بنے ہوئے ہیں خصوصاً یہ منظر کہ موت کی دیوی ایک ماں کی گود سے بچے کو پھینک رہی ہے بہ غایت دردناک ہے، ایسا ہی منظر ایلورا اور اجٹا کے غاروں میں بھی ہے۔ ان تمام غاروں میں بھی ایک بہترین غار ہے؛

غار نمبر ۸۔ یہ ایک غیر مکمل غار ہے جو شروع کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ صرف ایک ہال ۲۰×۲۷ فٹ تراشا گیا ہے جس میں بہترین نقاشی صرف کی گئی اگر یہ غار تکمیل کو پہنچا تو یقیناً سب غاروں سے عمدہ اور بہترین ہوتا۔

غار نمبر ۹۔ یہ بھی عمدہ غار ہے، مگر بالکل شکستہ ابتدائی ہال ۸۵×۱۹ فٹ ہے اس کے پیچھے دوسرا ہال ۱۵×۱۳ فٹ ہے اور اس کے عقب میں تیسرا ہال ۳۸×۱۳ فٹ اور اس کے بعد ایک اور چوتھا ہال $۱۴ \times$ فٹ ہے دوسرے ہال میں صرف بدہ کی مورت بٹھی ہوئی ہے۔ تیسرے میں دیواروں پر زنانہ مورتیں ہیں۔ چوتھے ہال میں بدہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے دیواروں پر ان گنت مورتیں ہیں ایک دیوار پر بدہ کی ۱۲ فٹ اونچی مورت بھی بٹھی ہوئی ہے۔

غار نمبر ۱۰۔ یہ تیسرے گروپ کا پہلا غار ہے جو بہت معمولی ہے۔

غار نمبر ۱۱۔ یہ بھی غار نمبر ۱۰ کی طرح معمولی غار ہے کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے۔

غار نمبر ۱۲۔ یہ غار گزشتہ دو غاروں کے نسبتاً کسی قدر اچھا ہے، مگر نامکمل ہے۔ صرف اس کا برآمدہ مکمل حالت میں ہے جو ۴۵ فٹ مربع ہے اس کے بعد کوئی چیز نہیں ہے یہ بالکل آخری غار ہے۔

دکن کی پہاڑی تراشیدہ مندر میں ان کو دوسرا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اجٹا کو اول اور ایلورا کو دوم درجہ پر رکھیں تو ان کے بعد انہیں کاغیر نامی بہ لحاظ صنعت و کاریگری بھی یہ غار اسی کے مستحق ہیں۔

ماخذ

گزیٹر مالک محروسہ سرکار عالی مرتبہ سر ولیم ہنٹر؛

گزیٹر مالک محروسہ سرکار عالی مرتبہ مولوی میرزا احمد علی علیجاں؛

واقعات مملکت بیجا پور جلد سوم مولفہ مولوی بشیر الدین احمد؛

تاریخ بیجا نگر مولفہ مولوی بشیر الدین احمد؛

تاریخ دکن سلسلہ آصفیہ مولفہ مولوی سید علی بلگرامی؛

نیوا میریل سرزاکٹ آرکیولوجیکل سرو مرتبہ مسٹر ہنری گزنس؛

رپورٹ سر شستہ آثار قدیمہ سرکار عالی مرتبہ مولوی غلام نیر دانی؛

تکمیل کاغذی

حالی اور شراردو

صالح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور شیر درد مند ان کے نہ ان کے درد کے درماں ہیں ہم پھوٹ پڑتے ہیں تماشہ اس چین کا دیکھ کر نالہ بے اختیار بلبلیں تالاں ہیں ہم حالی کی حیات پڑ بننے والے کے لئے بہت کم ایسا مواد فراہم کر سکتے ہیں کہ وہ کسی دلچسپ فسانے کی طرح محفوظ ہو سکے اگرچہ انہوں نے مستقل محنت اور مسلسل ترقیوں کے ساتھ ایک طویل عمر بسر کی لیکن جہاں تک خارجی حالات کا تعلق تھا ان کی زندگی کے زیادہ تر ایام بالکل خاموش گزر گئے۔ بائیس برس کی عمر کے بعد دو تین سال کے لئے حالی کے اس محیط زندگی میں تھوڑا سا ہیجان ضرور پیدا ہو گیا تھا، لیکن جوں ہی انگلو عربک اسکول دہلی سے ان کا تعلق ہو گیا اور وہ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اس سمندر کا سارا مدد جزر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا جن اتفاق سے اس کے بعد بھی ایسے موقع ملے گئے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ دنیا کے پر فتن ہنگاموں سے دور رہ کر گزار دی یہ ایک پر عظمت زندگی تھی، اور ہر پر عظمت زندگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ڈرامائی ہو!

یہ وہ زندگی تھی جن پر ایک ایسا سکوت چھایا ہوا تھا جو صرف ان وقتی الامم و مصائب سے ٹوٹتا ہے، جو ہر انسانی زندگی کے اجزاء لاینفک ہیں۔ کم عمری ہی میں ان کے والد اور والدہ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ اور اسی طرح عہد شباب میں بھی ہندوستان اس رستخیز بیجا (۱۸۵۷ء) کے سبب ان کی ملازمت بھی چھوٹ گئی، لیکن انہوں نے مرزا غالب یا میر تقی کی طرح نعرے دے کر ہرگز نہیں بلند کئے اور نہ کبھی حادثات کا مقابلہ کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کی قدرت نے ہی ان کی اس سنجیدگی اور میر تقی کا اس طرح بدلہ دیا کہ وہ کبھی گوشہ نشین نہیں ہونے پائے بلکہ ہر دفعہ ایک نئے طریقے سے ان کی قدر و منزلت اور ترقی کے اسباب مہیا ہوتے گئے اور انہیں عزت گزینی چھوڑ کر مختلف قسم کے ہنگاموں میں شریک ہونا پڑا۔

اردو ادب پر حالی کی سمجھنا چاہیے کہ حالی کی سوانح عمری میں اندرونی دلچسپیوں کا بھی فقدان ہے جو کاروباری اور علمی ہستیوں کے مقابلہ میں ادبی شخصیتوں کے لئے ضروری قرار دیجاتی ہیں۔ جب شادی کے بعد ان کا ذوق علم ان کو دہلی لے گیا اور وہاں کی ادبی مجلسوں میں ان کی آنکھیں کھلیں تو ان کو ایک جہاں دیگر نظر آیا جس میں ایک طرف تو غالب، لے حالی کی کوئی بسوٹ سوانح عمری اب تک نہیں لکھی گئی ان کی حیات کے متعلق دو چھوٹے چھوٹے رسالے جن میں سے ایک سیاب اکبر آبادی صاحب اور دوسرے سید محمد فاروق صاحب کا مصنفہ ہے۔ اس وقت راقم کے زیر نظر ہیں، ان کے علاوہ جو معلومات اس مضمون میں ہیں وہ ایسی ہستیوں سے حاصل کی گئی ہیں جو حالی سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔

مومن، ذوق، نیر، شفیقہ، علوی، ممنون اور صہبائی وغیرہ کے ناموں سے شعر و سخن کا مذاق رکھنے والی مجلسیں ہمیشہ گرم رہا کرتی تھیں۔ اور دوسرے بڑے مفتی صدر الدین، شاہ عبدالعزیز، فیض الحسن، سہارنپوری، مفتی عنایت احمد، مولانا اسماعیل شہید، احمد رضا خان صاحب بریلوی، محمد قاسم دیوبندی، احمد علی سہارنپوری، مولانا فضل حق خیر آبادی، سید احمد بریلوی، مولانا محمود الحسن، محمد فاروق صاحب چریا کوٹی، مولانا فضل الہی گنج مراد آبادی۔ اور عنایت رسول صاحب چریا کوٹی جیسی مایہ ناز شخصیتیں دنیاوی اور مختلف علوم و فنون کے اثرات اپنے ماحول پر بچھاتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ خود اردو زبان اس وقت تک متفرق آبادیوں کے باعث اس قابل بن گئی تھی کہ اس میں ادب و دانش کے علاوہ متفرق علوم و فنون کی کئی کتابیں لکھی جا چکی تھیں اور جن کی رفتار اس وقت بھی سرعت کے ساتھ رو بہ ترقی تھی اس قسم کے ماحول میں رہنے کے بعد ناممکن تھا کہ حالی وہ تمام سبق حاصل نہ کر لیتے۔ جو روزمرہ کے تجربوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اور نیز یہ کہ ان کی ذہنیاتی داستان دیسی ہی پر سکون رہتی، جیسا کہ ان کا بیرونی کردار تھا۔

حالی کی ذہنی نشوونما | حالی ابھی پچیس برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ وہ قیامت خیز واقعہ ظہورِ نرپریہوا جس کے باعث ہندوستان کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ اس واقعہ کے اثر سے دراصل کئی حساس ہستیوں کو ایک ایسا تازیانہ لگا جس کے بعد ان کے قدم ڈمگائے بغیر نہ رہ سکے۔ اگرچہ حالی کی سنجیدہ طبیعت پر ظاہری حیثیت سے اس کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا لیکن یہی وہ واقعہ ہے جس نے ان کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جس کے ذریعہ سے وہ غیر ارادی طور پر ایک عظیم الشان منزل تک پہنچ سکتے تھے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے حالی ضلع حصار کے محکمہ کلکٹری میں ملازم تھے لیکن اسی پر آشوب زمانہ نے ان کی یہ جگہ چھوڑا دی اور حالی کو کچھ دن پریشان رہنا پڑا۔ اس کے بعد جب پنجاب بک ڈپو کی ملازمت مل گئی تو اگرچہ وہاں کا ماحول ان کے لئے دلچسپ (بلکہ قابلِ برداشت) نہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے بعض اہم کام بھی بلندگی میں لیکن یہی سنگ بنیاد ہے اس عظیم الشان ادبی عمارت کا جس کو حالی اپنی آخر عمر تک بناتے رہے۔

لاہور بک ڈپو نے حالی کے لئے ایک ایسے دبستان کا کام کیا جس کی خوش چینیوں کے باعث ان کی طرزِ تحریر اور ذوقِ ادب میں خاص طور پر اصلاح ہوئی ہندوستانی انشا پردازوں کو راہِ راست پر لا ڈالنے کا کام اگرچہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قدردانانِ اردو نے بھی کیا تھا لیکن اس بک ڈپو نے حالی کے ساتھ جو کام کیا وہ بالکل جداگانہ تھا۔ حالی کو یہاں مغربی زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی اصلاح اور نظر ثانی کرنی پڑتی تھی اور اگرچہ انکو مغرب کی کوئی ایک زبان بھی نہیں آتی تھی لیکن وہ خوش قسمت تھے کہ ان کو مغربی مذاقِ ادب اور طرزِ تحریر سے نہایت آسانی کے ساتھ آگاہی ہو گئی۔ اس بارہ میں وہ اور ان کے ساتھ اردو ادبیات کرنل بالرائڈ کے مرہون منت ہیں جن کی نگرانی میں حالی کی اس قسم کی قوتوں کی نشوونما ہوئی۔ خواجہ حالی اردو کے انشا پردازوں میں وہ سب سے پہلے شخص ہیں جو مغرب کے ان تمام اسرارِ مخموری اور انشا پردازی پر عادی ہو گئے جن کے آثارِ

سربستہ بغیر مغربی زبانوں پر کافی دسترس حاصل کئے کہی بے نقاب نہیں ہو سکتے!

۱۔ ان کے متعلق دیکھو (۲) سیر المصنفین جلد اول (ب) یادگار غالب (ج) حیات جاوید (د) رسالہ سہیل جلد نمبر ۲
 ۲۔ دیکھو انڈیا آف انس لائبریری کی اردو کتابوں کی فہرست جو تقریباً تین سو صفحات میں تمام ہوئی ہے، اور جس میں صرف ۱۹۷۷ء سے قبل کی اردو کتابوں کا تذکرہ ہے۔

بک ڈپو کی ملازمت کی چار سالہ مدت اگرچہ خانگی حالات کے لحاظ سے حالی پر بہت شاق گزری لیکن اس عرصہ میں ان کے دماغ نے ایسے ایسے تخم حاصل کر لئے جس پر آگے چلکر نہایت ہی شاداب اور متاثر درخت پیدا ہونے والے تھے۔ !!

انگلو عربک اسکول دہلی اور
حالی کی ابتدائی نثری تصانیف

مغربی ادبیات کے ترجموں سے جس قسم کے نقوش تاثر حاصل کئے جاسکتے تھے ان تمام کو اپنے دل و دماغ پر ثبت کرنے کے بعد حالی انگلو عربک اسکول دہلی میں منتقل ہوئے یہاں اگرچہ وہ زمانہ اور ماحول باقی نہیں رہا تھا جس میں ان کے عہد شباب کی سرگرم گھڑیاں چند ہی سال قبل بسر ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی دہلی لاہور کے مقابلہ میں حالی کے لئے پسندیدہ مقام تھا۔ چنانچہ یہاں آنے کے بعد جہاں ان کی خانگی پریشانیوں کا خاتمہ ہو گیا ان کی ذہنی ترقی بھی جواب تک جاری تھی ایک خاص مرتبہ کو پہنچ گئی۔ جس کے بعد سے ان کی باضابطہ تحصیل علم ادب کو یا ختم ہو گئی۔

لاہور اور دہلی کی ملازمتوں کے زمانہ میں حالی کی زندگی کن کن حالات سے ہو کر گزری ہے ان کی تفصیل پیش کرنا ان کے سوانح نگار کا کام ہے۔ ہم اپنے اس مضمون میں ان کی ہستی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں جو اردو نثر سے متعلق ہے۔ حالی نے ابتداً اردو نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) تریاق مسموم اس زمانہ کے عام مذاق کے مطابق حالی کی ذہنیت بھی اول اول مذہب کی طرف بہت راغب تھی، چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں انیس بیس برس کی عمر میں انہوں نے صدیق حسن خاں بہادر (جو مابعد نواب بھوپال ہوئے) کے کسی وہا بیانہ مسئلہ کی تائید میں ایک رسالہ عربی زبان میں لکھا تھا۔ تریاق مسموم انہوں نے اپنے ایک ہوموطن نو عیسائی عماد الدین کے اعتراضات کے جواب میں لکھی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۶۸ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔

(۲) حال، کی اردو نثر کی دوسری کوشش ”پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے ہے“ اس کتاب کا موضوع بھی جیسا کہ ظاہر ہے مذہبی ہے۔ یہ کتاب غالباً شائع نہیں ہوئی۔

(۳) تیسرا کارنامہ مولود شریف ہے یہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیانی زمانہ کی کوشش ہے۔ مولود شریف کا بیضہ حالی کی وفات کے بعد اتفاق سے ان کے خانگی کاغذات سے برآمد ہوا۔ جو شائع ہو چکا ہے اس کی بعض عبارتوں کے نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ حالی کی ابتدائی نثر کی نوعیت اور اس کا اسلوب واضح ہو جائے اور نیز ان کے آخری زمانے کی طرز تحریر کے ساتھ اس کو جو تعلق ہے اس کا بہ آسانی اندازہ کیا جاسکے۔

”الہی ہواری کیا مجال اور کیا تاب و طاقت جو تیری نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں۔ تو قدیم ہم حادث، تو خالق ہم مخلوق، تیری نعمتیں بے انتہا“

”ہماری ابتدا ہی فنا اور انتہا ہی فنا، اگر ہم نے زبان سے تیرا شکر ادا کیا، یا دل سے تیرا احسان مانا، یا بدن سے تیری خدمت بجالائے“

”تو اس سے حق بندگی ادا نہیں ہوتا“

(صفحہ ۳۔ مولود شریف مطبوعہ حالی پریس پانی پت)

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھو حیات حالی از سید محمد فاروق صاحب صفحہ ۳۵

۲۔ یہ اور تریاق مسموم دونوں کتابیں راقم کی نظر سے نہیں گزریں ان کے متعلق معلومات کے ماخذ صرف سید محمد فاروق اور سیلاب صدیقی صاحبان کے حیات حالی کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔

”اے امت محمد! یہ تم نہیں جانتے کہ یہ اختصاص تم کو کہاں سے ملا؟ اور کیوں ملا؟ یہ سب اس ذات بابرکات کا طفیل ہے جس کی بدولت ایک تم کیا، تمام عالم، نعمت وجود سے بہرہ مند ہوا۔ وہ جو آدم سے پہلے نبی تھا اور خلق کی ہدایت کو سب سے پہلے پہنچا گیا۔ جس کے امتی ہونے کی موسیٰ علیہ السلام سے اولوالعزم نے آرزو کی۔ جس کی نبوت میں ساری نبوتیں یوں محو ہو گئیں جیسے دھوپ میں ستارے جس نے روز الست ربوبیت کا اقرار سب سے پہلے کیا، جس کا نام مبارک عرش مجید اور جنت کے دروازوں پر لکھا گیا۔ جس پر ایمان لائیکا اور جس کی نصرت کرنے کا عہد انبیاء سے لیا گیا“ (صفحہ ۸)

”بعض لوگوں نے پاس ادب چاہا کہ آپ کو سند پڑھنے سے روکیں۔ عبدالمطلب نے منع کیا اور کہا کہ یہ فرزند ارجمند کچھ نہ کچھ اپنی ذات میں شرف و بزرگی پاتا ہے جو یوں بے باکانہ داد کی سند پر بیٹھتا ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کو کوئی مرتبہ عالی ملنے والا ہے جو آج تک عرب میں کسی کو ملا ہے نہ ملے“ (صفحہ ۶۳)

۴۔ حالی نے اسی زمانہ میں طبقات الارض پر اردو میں ایک ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی جس کو مصر کے کسی عالم نے عربی میں منتقل کیا تھا۔ اسی عربی ترجمے سے حالی نے اس کو اردو کا لباس پہنایا۔

۵۔ اس سلسلہ کی آخری اور سب سے زیادہ اہم تصنیف مجالس النساء ہے۔ یہ کتاب اسی زمانہ میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے کہ ”جس کو الطاف حسین حالی مدرس مدرسہ انگلو عربی دہلی نے عورتوں کے لئے تصنیف کیا اور جو جناب لفٹ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر مدارس مالک پنجاب کے حکم سے لاہور کے سرکاری مطبع میں چھپی۔ ۱۸۸۳ء“ یہ کتاب تعلیم نسواں کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں اور دونوں حصے ملا کر چھوٹی تقطیع کے کوئی ڈیڑھ سو صفحات ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے صلہ میں سیاحی دربار دہلی کے موقع پر آپ کو گورنمنٹ کی جانب سے چار سو روپیہ کا اعزازی انعام بھی عطا ہوا جو لارڈ نارٹھبروک کے ہاتوں آپ کو ملا تھا۔ یہ کتاب غالباً پنجاب کے مدارس میں کچھ عرصہ تک داخل کورس بھی رہ چکی ہے۔

مجالس النساء کی وجہ سے ایک اہم تصنیف ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حالی کی اس قبل کی پہلی اور آخری کوشش ہے۔ حالی نے اس کے بعد کبھی فسانہ نویسی کی طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرا قابل ذکر امر جس کا اظہار ہمارے اس مضمون سے خاص طور پر متعلق ہے اس کتاب کی طرز تحریر ہے اس کا ایک سرسری مطالعہ ہی اس امر کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ اس کا مصنف ایک ایسا شخص ہے جو مغربی طرز تحریر سے اچھی طرح واقف ہے چنانچہ اس کتاب کی ابتدا حسب ذیل مطالعہ سے شروع ہوتی ہے جو نہایت اصلی اور سادہ ہے۔

اتوجی! آداب

برخوردار بڑہ سہاگن! بیگم یہ تمہارے ساتھ اور کون ہیں؟

ہیں اتوجی! آپ نہیں جانتیں؟ میری بھیلی ہیں۔

اے کون ہیں؟ مریم زبانی؟

۱۵۔ نہیں معلوم کہ یہ کتاب چھپی بھی ہے کہ نہیں صرف سید محمد فاروق صاحب کی حیات حالی میں اس کا ذکر ہے۔

۱۶۔ دیکھو حیات حالی از سید محمد فاروق صفحہ ۱۶

حضرت بندگی۔

بہلا بیابا بہت سی عمر، میاں جیے۔ بچے جیے۔ ہوا! تم کہاں؟

جی، میں ابھی آکے اتری ہوں۔

آؤ بیوی بیٹھ جاؤ۔ کوہ فراج تو اچھا ہے۔

حضرت خدا کا شکر ہے۔

بچے اچھے ہیں؟

سب آپ کو دعا کرتے ہیں۔

حالی کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالی جائے، اور کئی پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کر کے نذیر احمد کی اسی قسم کی مصنفات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے، لیکن ہمارے اس مضمون کے حدود اس قدر وسیع نہیں ہیں اس لئے ہم ذیل میں اس کتاب کے چند اور اقتباسات پیش کرتے ہیں کہ اردو داں حضرات کو (جن میں سے بہت کم حالی کی اس تصنیف سے واقف ہیں) معلوم ہو جائے کہ انہوں نے نذیر احمد کی طرز میں بھی کس کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ یہ کتاب اب بہت کم پائی جاتی ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کو دوبارہ شائع کیا جائے اور نیز نصاب تعلیمی میں بھی (خصوصاً زمانہ مدارس کے) شامل کیا جائے۔

”کیا تم اس بات پر بھولی ہو کہ باپ کے گھر میں خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے؟ داری ایسا خیال ہرگز نہ کرنا۔ بس خدا بڑی گھڑی ہی نہ لائے

نہیں تو ایک دم میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ہماری تو کیا بساط ہے جب بڑا وقت آتا ہے تو ملک کے دارش ایک ایک روٹی کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ خیر نادر گردی اور شاہ گردی کو تو ایک زمانہ گزرا، اسے جانے دو، یہ توکل کی بات ہے کہ جب غلام قادر نے شاہ عالم

کی آنکھیں نکالیں تو قلعہ اور شہر کیسی مصیبتیں پڑیں“ (مجالس النسا حصہ اول صفحہ ۵۵)

”لو بوا زبیدہ خاتون کا قصہ سن لیا۔ دیکھو اس کی ماں نے بیٹی کو پڑھا لکھا کر کیسا قابل کر دیا۔ کیا ہم آدمی نہیں ہیں، ہم چاہیں تو اس سے زیادہ اپنی اولاد کو آدمی بنالیں پر ویسی لیاقت کہاں سے لائیں۔

حضرت قصور معاف ہو تو کہوں، اس سے یہ کیونکر نکلا کہ مائیں بیٹیوں کو بھی پڑھا سکتی ہیں، ذکر تو میرے احمد مرزا پر چلا تھا، آپ اس پر زبیدہ خاتون کا قصہ لے بیٹھیں“ (مجالس النسا حصہ دوم ابتدائی عبارت)

”غرض سید عباس نے دو مہینے کے بعد اسلام بیگ اور غلام امام اور خواجہ ہدیل کو ہندوستان کی طرف چلتا کیا اور وہ زبیدہ خاتون کو دلی سے لیکر عرب چلے گئے، اول حج کیا پھر مدینہ شریف کی زیارت کی، وہاں سے استنبول کا راستہ لیا، جب زبیدہ خاتون وہاں پہنچ گئی

چند روز کے بعد سید عباس کی شادی ایک بہت بڑے امیر کی بیٹی سے ہو گئی۔ سب نے دہلی کا رہنا اختیار کیا۔ بس یہ قصہ تمام ہوا خداے تعالیٰ ہر ایک کو ایسی ماں اور ہر ایک ماں کو ایسی اولاد عنایت کرے۔ آمین“

(مجالس النسا حصہ دوم آخری عبارت)

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر ضرور خریدنا چاہیے۔

اردو ادب میں انقلاب

حالی جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس سے ایک دو سال قبل ہی سے اردو نثر میں انقلاب شروع ہو چکا تھا، چونکہ وہ فارسی کی جگہ عدالتوں کی زبان بن گئی تھی، اس لئے قانون اور حکومت کی وہ تمام اصلاحیں جو پہلے بالعموم فارسی تھیں اب اردو میں منتقل ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد ہی گورنمنٹ کو سرکاری مدارس کے لئے ایسی کتابیں تیار کرانی پڑیں جن کے موضوع مغربی طرز کے تھے۔ اسی سلسلہ میں ۱۸۳۵ء میں جب اخباروں کو آزادی مل گئی تو دہلی سے کئی اخبار نکلنے لگے ان تمام کا اثر یہ ہوا کہ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی ذہنیات میں تبدیلی ہونے لگی جو ۱۸۳۷ء تک مسلسل ترقی کرتی گئی، لیکن اس کے بعد جب سرسید نے مغربی خیالات و حالات سے متاثر ہو کر قوم کی اصلاح و ترقی کا جھنڈا بلند کیا اور مخالفین و موافقین دونوں کو طرح طرح سے اپنی طرف متوجہ کیا تو قومی اصلاحوں اور کامیابیوں کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی رفتار میں بھی خاص مہیاں پیدا ہو گئیں، اور یہی وہ مہیاں ہیں جو آج اردو کو ہندوستان کی جلالت بھاشا بنانے میں سرگرم سرسید نے کئی طریقوں سے اردو کی خدمت کی؛ پہلے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد ہر قسم کی علمی کتابوں کو مغربی زبانوں سے اردو میں منتقل کرنا تھا، اس کے بعد ایک اخبار نکالنا شروع کیا جو اس سوسائٹی کا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ آخر میں انہوں نے وہ قابل یادگار کام کیا جو اردو ادبیات میں ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیگا۔ یہ کام ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت تھی یہ وہ رسالہ ہے جس نے ہندوستان کے خوابیدہ علم و ادب کو اپنی غیر معمولی عیسائی فہمی سے زندہ کیا اور جس میں اردو کے عناصر خمسہ کی نشوونما ہوئی۔ انہیں عناصر خمسہ میں سے ایک حالی بھی ہیں سرسید کے خیالات سے متاثر ہونے کے بعد حالی نے اردو نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ اردو کے لئے مایہ صدفنازش و افتخار ہے۔ سرسید اور حالی دونوں تقلید کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ شدت تقلید ہی تو تھی جس نے سرسید کو حد درجہ بدنام کر رکھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سرسید کی تقلید میں جدت اور اختراعی قوت کے مظاہر بھی موجود تھے، اسی وجہ سے یہ بدنامی پائدار اثرات نہیں قائم کر سکی۔ یہی حال مولوی حالی کا ہے۔ وہ سرسید کی ہستی کو کئی لحاظ سے قابل تقلید سمجھتے تھے اور صرف یہی نہیں، وہ سرسید کے پس گرویدہ تھے کہ ایک دو دفعہ علی الاعلان کہہ دیا کہ سرسید ہی وہ ہستی ہے جس نے مجھے اپنا بنا لیا ہے

آں دل کہ رم نمودہ از خو برو جواناں،

دیرینہ سال پیرے بڑش بکینگا ہے

سرسید کی نثر جدید خیالات کی اشاعت کا ایک زبردست آلہ تھا اس سے انہوں نے اس وقت کام لیا تھا جب کہ اردو زبان میں کوئی نثر (صحیح معنوں میں) موجود نہ تھی۔ ان کی طرز تحریر کی بعض خصوصیات

ذیل میں اس لئے پیش کی جاتی ہیں کہ ان سے حالی کی طرز تحریر کا مقابلہ کیا جائے۔

(۱) وہ تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے۔

(۲) وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم ہوں اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح لفظوں پر ترجیح دیتے تھے، اس کے علاوہ دلی کی بول چال پر بھی قانع نہ تھے۔

(۳) وہ الفاظ و قواعد کا محکوم رہنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ الفاظ و قواعد کو اپنے جذبات و خیالات کا محکوم رکھتے تھے۔

ہر عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

- (۴) تشبیہوں اور استعاروں سے زیادہ کام نہیں لیتے تھے، جو کچھ تشبیہیں اور استعارے ان کی عبارتوں میں ہیں سب بر محل اور میاں ہیں۔
 (۵) وہ اکثر دفعہ واقعات اور مناظر کی تصویریں سنگی کھینچا کرتے تھے۔
 (۶) مختلف مضامین مثلاً علمی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، قانونی، نظریات وغیرہ میں سے ہر ایک کو اسی پیرایہ میں لکھتے تھے جو اس کے لئے بالکل مناسب ہو۔

سر سید اور حالی کی ذہنیات | سر سید اور حالی کی ذہنیاتوں اور ان کی نوعیت کا اس وقت صاف طور پر پتہ چل جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید جس طرح اگرچہ تقلید کی طرف بہت جلد راغب ہو جاتے تھے، لیکن کبھی ادھا دھند

تقلید نہیں کرتے تھے، بالکل اسی طرز پر مولوی حالی بھی عمل پیرا رہا، اگرچہ اپنی ذاتی اسٹیج سے کام لیتے ہیں۔

اگرچہ ان کی طرز انشا پر دازی پر سر سید کا گہرا اثر پڑا، لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنی شخصیت کو بھی برقرار رکھا۔ سر سید کے اسلوب سے وہی باتیں اخذ کیں جن کو وہ اچھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان سے متاثر ہونے کے بعد حالی نے جو کچھ لکھا، اس کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کرنل ہالرائڈ نے جس اعلیٰ مذاقی اور جدید طرز روش کو حالی سے روشناس کرایا تھا، اب اس میں کافی ترقی ہو گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر سید اسلوب میں جو جو نقصانات رہ گئے تھے ان کو حالی نے اپنے اسلوب میں بالکل دور کر دیا اور جو خوبیاں تھیں ان کو اور بھی چمکا دیا۔

حالی کی طرز تحریر | حالی کے متفرق مضامین، ان کا مقدمہ شعر و شاعری، ان کی یادگار غالب اور حیات سعدی کے مطالعہ کے بعد ہم ان کے اسلوب بیان کی جو خصوصیات قائم کر سکتے ہیں وہ اس امر کی کافی شہادت دیتی ہیں کہ حالی کا اسلوب سر سید کی طرز تحریر کی ایک ترقی یافتہ، پختہ اور جامع شکل ہے، چنانچہ ان کی طرز تحریر کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں:-

- (۱) ان کی عبارتوں میں ظرافت، شوخی، اور طعن و تشنیع بالکل نہیں، برخلاف اس کے وہ ہر بات کو سنجیدگی اور متانت سے ادا کرتے ہیں۔
 (۲) ان کے کلام میں فارسی و عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور اس قسم کی جدید ترکیبیں بہت کم ہیں، جو آج کل کے نوجوان انشا پردازوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

(۳) وہ بازاری، سوقیانہ اور قبیلہ الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

(۴) تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کم کام لیتے ہیں۔

(۵) ان کی تحریر میں خود پرستی اور تعلی نہیں پائی جاتی اور اگرچہ وہ خود کو کبھی بڑا عالم دادیہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے لیکن اکثر جگہ ان کی اعلیٰ علمیت اور ادبیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

(۶) وہ حتی البسع اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی عبارت منطقی حدود سے باہر نہ ہونے پائے۔

لے واضح ہو کہ حالی نے تیس سے زیادہ بڑے بڑے مذہبی تنقیدی اور علمی مضامین لکھے ہیں، ان کا مجموعہ ۱۹۰۴ء میں مولانا وحید الدین سلیم نے چھپوایا تھا جو اس وقت کم باب ہے اور اب حیدرآباد سے مولوی احمد عارف مولف بزم اردو، اور خیابان اردو کی سعی تبلیغ سے شایع ہو رہا ہے۔

حالی کی انفرادیت | ان خصوصیات کے معلوم کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ حالی نے سرسید کی محض تقلید نہیں کی بلکہ اپنی ذات سے ہی اپنے اسلوب میں اس قدر قابل وقعت تبدیلیاں کیں کہ ان کا اسلوب اس زمانہ کی اردو شراورد اس کی نوعیت کا ایک بہترین نمونہ بن گیا۔

انہی تذکرہ بالا خصوصیات میں سے بعض ایسی بھی ہیں جن کی وجہ سے حالی کی عبارتیں عوام میں خاص طور پر مقبول نہ ہو سکیں۔ اور اگر اس بارے میں وہ سرسید کی بعینہ تقلید کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی تشریح زیادہ عام پسند ہو جاتی۔ لیکن حالی کی خود دار انفرادیت نے اس امر کو ہرگز گوارا نہیں کیا کہ وہ سرسید احمد خاں کے اسلوب کی اس خصوصیت کو بھی اختیار کر لیتے جو ان کی نظر میں سنجیدگی اور علمی وقار کے خلاف تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے سرسید اور حالی کے اسالیب میں امتیازی شان جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

حالی کی ترکیبوں عام طور پر مقبول نہیں ہوتی | عام اردو داں مولوی حالی کی عبارتوں کو اس لئے خشک سمجھتے ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ :
(۱) ان میں اشیاء کے (اور بالخصوص اس زمانہ کے) عام مذاق کے مطابق یورپ والوں اور جدید خیالات پر طعن و تشنیع نہیں کی جاتی۔ نیز مخالفوں پر اعتراضات کے علاوہ ان کے حملوں کے سخت سے سخت جوابات نہیں دیے جاتے۔

(۲) ان میں شوخی، ظرافت اور رنگینی نہیں پائی جاتی بلکہ سنجیدگی اور متانت پڑھنے والے کو گراں گزرنے لگتی ہے۔
(۳) ان میں نئی نئی اور عجیب و غریب ترکیبیں، عربی و فارسی کے مرکب الفاظ، اور رنگارنگ تشبیہیں اور استعارے بہت کم نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہی چیزیں سطح آشنا نظروں پر اثر ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔
(۴) ان میں استدلالی پہلو بہت زیادہ ہوتا ہے، شاعری، عبارت آرائی نہیں ہوتی۔
ذیل میں حالی کی بعض ان عبارتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں جو سرسید سے متاثر ہونے کے بعد لکھی گئی تھیں اور جن میں تذکرہ بالا خصوصیات کی جھلک بہت دکھائی دیتی ہے۔

” (۱) جس قدر ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ عالم مادی ہے اسی قدر ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم سب کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں۔ اور جیسا ہم کو پہلے یقین میں ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید یہ تمام نمائش عالم خواب کی سی نمائش ہو، ویسا ہی ایک ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید ہمارے یہ سب افعال و حرکات ایسے ہوں جیسے قطب نما کی سوئی کی حرکت۔ لیکن ایسے ضعیف احتمالات سے یقین زائل نہیں ہو سکتا۔“

(مضمون تدبیر ص ۵ مطبوعہ سلسلہ تالیفات وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرتسر)

” (۲) شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر بے سروسامانی اور متوکل رویوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے، اور بعض موقعوں پر اس کو حالت سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذا میں پہنچی ہیں۔“

(حیات سعدی صفحہ ۳۵ مطبوعہ نیواپریل پریس لاہور ۱۹۵۷ء)

ہرثم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہرثم کا عطر منگانا چاہیے۔

” (۳۶) مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے، وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا، دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے، اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے اُن کے دوست ہر ملت و مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بکھارتے تھے۔ (یادگار غالب صفحہ ۵۵ مطبوعہ فیض عام پریس علی گڑھ)

” (۳۷) رہی دوسری بات سو اس کا تو ہمارے شعرانے کہی ہو لکھ بھی خیال نہیں کیا جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہیں وہاں اور بھی پھسل پڑتے ہیں اور نہایت فخر کے ساتھ ناگفتنی باتوں کو کلمہ کہلا بیان کرتے ہیں۔

(مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۳۱۹ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ)

حالی کی انشاپردازی کے تقاض | ان اقتباسات کے ملاحظہ کے بعد جہاں ہمیں حالی کی متانت اور نچتہ کارانہ تحریر کا ثبوت ملتا ہے وہیں اُن کے اسلوب کی ایک دو خصوصیات تقاض کی شکل میں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اُن کے اسلوب کی ایک دو خصوصیات تقاض معلوم ہونے لگتی ہے اور اکثر جگہ ادبی شان باقی نہیں ہوتی، اگرچہ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ اردو میں ہر طرف رنگین اور پر تکلف عبارتیں لکھنے کا عام شوق اور مذاق پھیلا ہوا ہے اس قسم کا رد عمل ضروری تھا اور اس حیثیت سے حالی کی یہ کوششیں ضرور قابل قدر ہیں۔ لیکن وہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک اعلیٰ انشاپردازی کا زندہ نمونہ ہرگز نہیں بن سکتیں۔ انشاپردازی کا دار و مدار خود حالی کے خیال کے مطابق صرف خیالات پر نہیں بلکہ الفاظ پر بھی ہے۔ چنانچہ اسی امر پر انھوں نے اپنے مقدمہ دیوان (یعنی شعر و شاعری) میں زیادہ بحث کی ہے اور بعض جگہ حد اعتدال سے بھی متجاوز ہو گئے ہیں۔

اقتباسات بالا میں دوسری چیز جو کھٹکنے لگتی ہے وہ انگریزی طرز بیان کی تقلید ہے۔ پہلے ہی یہ ذکر گذر چکا ہے کہ سرسید کی طبع حالی بھی تقلید کی طرف زیادہ راغب تھے اور ان دونوں کی تقلیدیں ادب و ہند نہیں مگر جدید تر ایہم حالی نے اس انگریزی کی تقلید کی خاطر ایک ایسی یادگار چھوٹی ہے جو کسی وقت بھی پڑھنے والے پر اثر کے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ جیسا کہ مدی میں سعدی کو ”اُدُر ان کی“ کے بجائے ”دہ“ اور ”اسکی“ کا استعمال ہے یہ اردو دانوں کے لئے ایک نئی بلکہ معیوب چیز ہے۔ حالی جب غالب اور سرسید کی زندگی کے واقعات لکھنے بیٹھتے ہیں تو آپ (۳۸) ”استعمال کرتے ہیں، لیکن جب سعدی کا حال لکھتے ہیں جن کی عظمت کسی حیثیت سے ان دونوں سے کم نہ تھی“ تو وہ اور اس کا استعمال (۳۹) ان کی تحریر میں خود پرانی حیات سعدی کا مطالعہ کرتے وقت اکثر جگہ پڑھنے والے کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

اور ادبیت ظاہر ہو جاتی نقص جو اقتباسات بالا میں ظاہر نہیں ہوتا انگریزی الفاظ کا بے دھڑک استعمال ہے، وہ اردو کو ہندوستان (۴۰) ”دہ“ حتیٰ البس اس بات کی کمزوری سمجھتے تھے کہ اس میں متفرق زبانوں کے الفاظ اور ترکیبیں فیاضی کے ساتھ استعمال کی جائیں اور واضح ہو کہ حالی نے تیس سے زائد ہونے لگے تھے کہ بعض بعض مقامات پر انگریزی کے ایسے ایسے نامانوس الفاظ استعمال کر دیے ہیں جن کا چھپوایا تھا جو اس وقت کم یا نہی سے ادا کیا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے بعض الفاظ ملاحظہ ہوں۔

شایع ہو رہا ہے۔

طبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔

اصغر علی عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر سے منگانا چاہیے۔

Affiliate, Graduates, Imagination, works
Christianity, oriental, Biography, leading article
Civilization, remarks, literary point, circle
life -

حالی کی نثر اور حیات جاوید حالی کا زبردست شاہ کار ہے چونکہ یہ ان کی آخر عمر کی پیداوار ہے اس لئے ان کی مخصوص طرز انشا کی جس قدر مکمل ترجمانی اس کتاب سے ہوتی ہے ان کی کسی اور تصنیف سے نہیں ہوتی، حیات جاوید اور حالی کی دیگر مصنفات کے اسلوب میں کچھ فرق ضرور نمایاں نظر آتا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ حیات جاوید کے اکثر جملے بہ نسبت حیات سعدی اور یادگار غالب کے جملوں کے زیادہ طویل ہیں اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسید کی لائف لکھتے وقت چونکہ ان کو ایک مختصر کتاب کے ذریعہ بہت زیادہ مطالب کو پیش کرنا مقصود تھا اس لئے بڑے بڑے مرکب جملے لکھنے پڑے، مثلاً حسب ذیل جملوں سے ظاہر ہو جائیگا کہ وہ کس طرح کئی کئی مطالب ایک دو جملوں ہی میں ادا کر جاتے ہیں۔

”دوسرے آرٹیکل میں جس کا عنوان ”در نیکر یعنی ہماری زبان“ ہے انھوں نے اول ان مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو دینی زبانوں میں ترجمہ کر کے تیار کرنے میں پیش آتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے قائم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لئے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عجب کی نگاہ سے ظاہر کیا ہے“ (حیات جاوید - طبع دوم صفحات ۲۹۴-۲۹۵)

”سب بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزار ہزار سے متجاوز ہو گئی نہ کسی سیر اور تماشہ کی غرض سے، کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لئے، بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بہلائی کے ارادہ سے ہوتا ہے اس میں شریک ہوں۔ دور دراز سفر کی تکلیف اور آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک جگہ کہانا کھاتے تھے، ایک جگہ رہتے تھے، قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ ہنستے تھے، بولتے تھے، انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا۔ دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا، اور اس طرح ایک مردہ قوم کے اجزائیں روز بروز الٹیاں پیدا ہو جاتا تھا“

”ان کا ارادہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آکر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہو گئے، اور زیادہ تر اس سبب کہ جو کتابیں لندن میں باسائی میسر آسکتی تھیں ان کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا مگر جو مباحث سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے ان میں سے چند کے سوا سب تفصیلی یا اجمالی جواب اس ایک جلد میں آ گیا ہے“ (حیات جاوید طبع دوم صفحہ ۳۳۸)

مولوی حالی کے اسلوب کی یہ خصوصیت کہ وہ بید بخیدہ تھے حیات جاوید میں یک زبردست نقص کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اسکی سبب بڑی مثال یہ ہے کہ حالی نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ناول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن ۱۵۰ سال بعد سنجیدہ انسان تھے کہ جب سرسید کو اس ”سنخیر بجا“ کے درمیان پیش کرتے ہیں تو اس تمنائیت اور بے پروائی کے ساتھ عبارت آرائی کرتے ہیں کہ گویا یہ ایک بالکل معمولی واقعہ ہے، حالانکہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں ایک زبردست ادیب کے سمجھنا

اثر سے اس کا دماغ یقیناً محتر خیالات بن سکتا ہے۔ چنانچہ خود سرسید اور ان کے علاوہ غالب، آزاد اور نذیر احمد وغیرہ جن جن انشا پر اردو نے ہی اس "رستخیز" کا ذکر کیا ہے، وہ سب اپنا متاثر ہونا پوشیدہ نہ کر سکے، ایک زبردست ادیب کا اہم ترین فرض یہ ہی ہے کہ وہ جس واقعہ سے متاثر ہو اس کی تصویر اس قدر جذباتی اور پر جوش کہیں دے کہ دیکھنے والے پر بھی اس کا گہرا اثر ہو حیات جاوید کا تیسرا باب (جس میں سرسید اور غدر کی حالت کا اظہار کیا ہے) شروع سے آخر تک پڑھائیے، لیکن کہیں اس امر کا پتہ نہیں چلتا، کہ لکھنے والے نے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

اسی طرح سرسید (حیات جاوید کے ہیرو) کی وفات کا جہاں حال لکھا ہے جوش و جذبات کو بالکل طاق میں رکھ دیا ہے، ورنہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں انہیں اپنی سنجیدگی کا نقاب دور کر کے ضرور قلبی کیفیت ظاہر کر دینی چاہیے تھی۔

اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے کہ ہر انشا پر داز کی شخصیت اس کی تحریروں میں کہی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالی کی شخصیت کی جھلکیں بھی ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں ضرور نمایاں ہو جایا کرتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حصہ ان کی متانت اور سنجیدگی کا ہے۔ "حالی کی متانت مقفی تھی، کہ

حالی کی شخصیت ان کی تصنیفات میں

مخمل میں ٹھیکر واہ و اکنا تو کجا آہ بھی نہیں کہنچا چاہیے۔ جس قدر آزاد کی شخصیت ان کی تحریروں میں پھٹی پڑتی ہے اتنی ہی حالی کی طبیعت چھپی رہتی ہے، وہ کہی ظاہر ہونا نہیں چاہتے۔ مگر باوجود اس کے بعض موقعوں پر وہ ظاہر ہوئے بغیر ہی نہیں رہ سکتے۔ اس بارے میں وہ اردو کے بارڈ میکاے ہیں۔ کیونکہ جس طرح آزاد کارلائل کی طرح اپنے جوش و جذبہ سے مجبور ہو کر ہر وقت ظاہر ہوتے رہتے ہیں، حالی بھی میکاے کی طرح سنجیدگی اور خود داری قائم رکھنے کا التزام کرتے ہیں اور جس طرح میکاے کی تحریروں میں ذاتی معققات و امیال کی جھلک نمودار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ حالی کی عبارتیں بھی کہیں نہ کہیں اپنے مصنف کی قلبی گہرائیوں اور دماغی کیفیتوں کا پتہ دیتی ہیں اس کی بعض مثالیں خطہ ہوں۔

(۱) ایک جگہ وہ تہذیب الاخلاق کی غیر معمولی کامیابی اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے اپنی طرز تحریر کی ایک بڑی خصوصیت پر خاص زور دیتے ہیں یعنی یہ کہ "اس تہذیب الاخلاق میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت سخت ضرورت کے سوا کہی نہ دیے جاتے تھے اور اس لئے مناظرہ کے لئے مزہ رد و بدل اور جواب و رد جواب و رد جواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا"۔

(۲) حیات جاوید میں ایک اور جگہ انہوں نے اپنی فطری سنجیدگی، بے تعصبی اور سلیم الطبعی کا غیر ارادی طور پر اظہار کیا ہے ان کا خیال ہے کہ اردو ہندوستان کی جلّت بھاشا بن کر رہے گی، اور ہندوؤں کی مخالفت آخر کار ناکام ثابت ہوگی اس ذاتی رائے کے اظہار کے لئے انہوں نے سرسید کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ "جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے، وہی آگے چلکر ان کو یہ سبق دے گی، کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے

۱۵ روح تنقید - دیباچہ صفحہ ۲۴

۱۶ یہاں چند جملے میں نے اپنے مضمون اردو کے اسالیب بیان سے ماخوذ کئے ہیں۔

۱۷ حیات جاوید طبع دوم - صفحہ ۱۱۴

اصغر علی محمد علی سے ہر قسم کا عطر خریدنا چاہیے

کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اعلیٰ عورت حاصل نہیں کر سکتے۔^{۱۵}

”اس موقع پر اس خاص واقعہ کا لحاظ رہے کہ سرسید کے خلافت مولوی حالی نے اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ سرسید کو تو یقین تھا کہ وہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔“

حالی نے خود سرسید کے الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ”انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بتارس میں پھیلا ایک وفد مسٹر شکپر سے جو اس وقت بتارس میں کشتہ تھے مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ اور وہ تعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہیگا وہ دیکھے گا۔“^{۱۶}

اس عبارت اور حالی کی ذاتی عبارت (جو اوپر پیش کی گئی ہے) کا مقابلہ کرنے کے بعد صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر حالی اپنی شخصیت کو چھپانہ سکے اور اپنے ہیرد کے خیالات کے خلاف اپنی رائے غیر ارادی طور پر پیش کر دی۔ واقعہ ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ مصنف بھی اپنی تحریر میں اپنی شخصیت کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۳) اس کتاب کے دوسرے حصہ میں ایک جگہ حالی کی شخصیت بیدہرک طریقے پر ظاہر ہو گئی ہے۔ اور یہ بات اس قدر اہم ہے کہ اس پر ان کی پوری کتاب حیات جاوید کی اہمیت کا احضار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی اصلاح کے خیال کو سرسید کی ترقی کا اہم ترین سبب ثابت کرنے میں انہوں نے اپنی ذاتی معتقدات کے مطابق عمل کرتے ہوئے، ایک زبردست اور اصولی غلطی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بھودہ کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے اسلام کی بالراست کوئی خدمت کی ہے یا اسلام نے (بحیثیت مذہب) ان کو شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کے لئے مجبور کیا تھا، ایک ایسا شخص جس کی نظر میں جنت اور دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں جس کے پاس شیطان اور جن کا کہیں خیال نہیں، جو معجزے کے قائل نہیں اور جس کے نزدیک اسلام ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ بدقت تمام مذہب کی خاطر اس قدر جان جو کھوں کے کام کر سکتا ہے دنیا کے اکثر بڑے بڑے فاتح اور عظیم الشان ہستیاں وہی گزری ہیں جنہیں مذہب کی مادی جزا و نثر پر اعتقاد کامل تھا اور جو فرشتوں اور حوروں کو مرتے دم اپنی آنکھوں سے خوش آمدید کہتے ہوئے دیکھتی تھیں۔

یہ تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے مذہب کو دیکھنے والا ایک شخص جو یہ جانتا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی اصلاح و راستی کی کوئی ضرورت نہیں اور جو بذات خود جامع و مانع ہے، اس کی خرابیوں کو دہر کرنے اور اس کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کے لئے اس قدر سخت کوشش کرے!

۱۵ حیات جاوید طبع دوم صفحہ ۹۷

۱۶ حیات جاوید صفحہ ۹۴

۱۷ حیات جاوید صفحہ ۹۴

۱۸ تفسیر قرآن از سرسید احمد خاں

اگر سرسید کے ماحول کو دیکھا جائے تو اس امر کا ثبوت بآسانی بہم پہنچ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کی بہ حیثیت مذہب نہایت اچھی حالت تھی اور مسلمان خاص طور پر دینداری کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ خود حالی نے لکھا ہے دار الخلافہ کا آخر دور تھا اور مسلمانوں کی آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے، خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔^{۱۵}

جب خود مسلمان اس شدت سے مذہب پر عمل پیرا تھے تو پھر سرسید کو اسلام کی طرف متوجہ کر نیکی کیا ضرورت تھی؟ نہایت افسوس کا مقام ہے، کہ حالی نے (چونکہ خود نہایت دیندار اور متقی تھے) اس موقع پر ارادی یا غیر ارادی طور پر غلطی کی، اور اس امر کو اس شد و مد سے لکھا کہ یہی حصہ اسلوب بیان کی حیثیت سے ان کی کتاب کا شہ پارہ بن گیا ہے۔^{۱۶}

سرسید کو اسلام کا درد نہیں اکرا رہا تھا بلکہ مسلمانوں کی ردی حالت اور یہ ردی حالت دینی نہیں تھی بلکہ دنیاوی، مسلمان دنیا داری میں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اور اسی میں ان کو راہ راست پر لانا سرسید کا عین مقصد تھا۔ اس مقصد کا تعلق بالراست مذہب تک نہیں بلکہ قومیت سے ہے۔ مولوی حالی کا خیال کہ ہندوستانی قومیت کے خیال سے پہلے نا آشنا تھا اس لئے سرسید کو اب کس طرح اس کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اور اگر پیدا ہو بھی تو کس طرح اس قدر دیر پا ہو کر بڑے بڑے کام کر دکھاتا ہے، بالکل سطحی معلوم ہوتا ہے۔ سرسید میں اگر قومیت کا خیال یکایک جوش و خروش کے ساتھ پیدا ہو گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ وہ زمانہ اور ماحول ہی ایسا تھا کہ کسی درومند اور بلند حوصلہ شخص کو اس قسم کا خیال ضرور پیدا ہو جاتا۔ کہ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ جس طرح حالت موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات سن سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں، اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یورپ کے رفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا زبانی سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔^{۱۷} کہی کوئی بڑے بڑے کام دوسرے بڑے کاموں کی نظیر یا مثال سے نہیں کئے جاتے۔ اور کوئی بڑا شخص دوسری قوموں کے بڑے شخصوں کے حالات سن کر بڑا نہیں بنتا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے جہاں کہیں کسی ملک و قوم کو کسی بات کی ضرورت ہوتی ہے تو خواہ وہ کیسی ہی اجنبی اور نئی ہو وہ اس کو لا محالہ کر بیٹھتے ہیں، اور کرنے سے پہلے ان کو یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں، تاریخ عالم میں اس کی سیڑیوں مثالیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اگر کوئی شخص سرسید کی لائف اور ان کی تصنیفات سے واقف ہونے کے بعد اس متذکرہ مسئلہ پر نظر ڈالے تو اس کو صاف طور پر واضح ہو جائیگا کہ سرسید نے اپنا مٹھ نظر قوم کو بنایا ہے نہ کہ مذہب کو ہم اس وقت اس مسئلہ کو طول دینا نہیں چاہیے۔ یہاں صرف اس امر کا اظہار مقصود تھا کہ حالی کی شخصیت کس طرح ان کی تصنیفات میں ظاہر ہو جایا کرتی ہے؟

۱۵ حیات جاوید صفحہ ۲۱۹

۱۶ حیات جاوید ۲۱۸ تا ۲۲۵

۱۷ حیات جاوید صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸

۱۸ حیات جاوید ۲۱۷

(۴) اس اظہار شخصیت کی ایک اور مثال مقدمہ (شعر و شاعری) میں بھی پائی جاتی ہے جہاں مولوی حالی شاعری کی اصلاح کا ذکر کرتے وقت اپنے متعلقہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں اور اپنا نام ظاہر نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ یہ ممکن ہے کہ نئی روش پر چلنے والا شاعر کوئی مضمون زمانہ کی ضرورت اور مقتضائے حال کے موافق شعر کے لباس میں جلوہ گر کر کے ملک کے جدت پسند لوگوں میں کچھ مقبولیت یا شہرت حاصل کر لے اور ایک خاص حیثیت سے اس کے کلام کی داد توقع سے زیادہ اُس کو مل جائے، مگر شاعرانہ حیثیت سے نہ تو فی الواقع وہ اس کے کلام کی داد ہوتی ہے اور نہ وہ اس کو داد سمجھتا ہے۔ بلکہ ایسی داد منکر چپکے ہی چپکے اپنے دل میں یہ شعر پڑھتا ہے۔“

بھون الودہ دست دینغ غازی ماندہ بے تحسین

تو انکوں زیمہ باری نیت برگستواں مینی؛

شعراے ہمعصر کچھ تو قدیم شعری کے تعصب اور زیادہ تر اجنبیت اور بیگانگی مذاق کے سبب اس روش کو اس حجت سے کہ وہ شاعر عام سے الگ ہے تسلیم نہیں کرتے اور بعض اپنے نزدیک اس کی بوجھ اس طرح فرماتے ہیں کہ فلاں شخص نے شاعری نہیں کی بلکہ مفید اور اخلاقی مضامین لکھ کر اپنے لئے زادِ آخرت جمع کیا ہے۔ لیکن اگر وہ فی الواقع موجودہ نسل کی قدر شناسی سے قطع نظر کر چکے ہیں تو اس کو ایسی باتوں کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے بلکہ یہ امید رکھنی چاہیے کہ قوم کی زمین میں کچھ آل باقی ہے تو تخمِ اکارت نہ جائیگا۔
واقعہ ہے کہ خود حالی کے اس شعر کے مطابق کہ

سُنیں گے نہ عالی کی کب تک صدا

یہی ایک دن کام کر جائے گی

آخر کار اردو شاعری کی کایا پلٹ ہو گئی اور اُن کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ کیا اس متذکرہ بالا اقتباس سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ اس میں حالی نے خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے؟ لیکن بہت ممکن ہے کہ وہ غیر ارادی طور پر یہ لکھ گئے ہوں۔

حیاتِ جاوید، یادِ گار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں اکثر ایسے مقامات بھی تھے جہاں حالی اپنی ذات کے متعلق بہت کچھ شرح و بسط کے ساتھ لکھ سکتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی فطرت میں تغلی نام کو نہ تھی، وہ پہلے تو اپنا ذکر کرنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے تھے، لیکن جہاں کہیں اس پر مجبور ہو جاتے ہیں تو اس خاکساری سے اپنا ذکر کرتے ہیں کہ اُن کی شخصیت کی ایک خاص عظمت نمودار ہونے لگتی ہے، مثلاً یادِ گار غالب میں جہاں مرزا کی نثر اردو پر ریو یو کیا ہے، میر ہمدی مجروح کے متعلق خط میں انہوں نے نہایت عاجزی اور صداقت کے ساتھ اپنے متعلق لوگوں کے خیالات کی تردید کی ہے۔

حالی کی مصنفات میں

اُن کی بے لوثی

اردو کے بڑے بڑے ثقہ اور سنجیدہ انشا پردازوں کی مصنفات میں بھی اس قسم (یعنی تغلی اور خود نمائی) کے عجوبہ پائے جاتے ہیں، آزاد کی اکثر تحریروں میں اُس کی جھلک نمایاں ہے۔ خدا رکے نواب حیدر یار جنگ طباطبائی کی شرح دیوان غالب اور تلخیص عروض و قافیہ ایسی

۱۵ مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ الناظرین لکھنؤ، صفحات ۲۵ اور ۲۶

۱۶ یادِ گار غالب مطبوعہ فیض عام علی گڑھ صفحہ ۱۵۹

۱۷ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خرید فرمائیے

مثالوں سے خاص طور پر الامال ہیں، علامہ شبلی جیسا مہتمم با شان انشا پر داز بھی اس عیب سے بچ نہ سکا۔ شعر اعجم حصہ اول میں جہاں اردو کی کا بیان ہے مولانا نے اس کے مشہور قصیدے کا ذکر کیا ہے۔ جس کا پہلا شعر ہے ۵

بوے جوے مولیا آید ہے یاد یار ہر باں آید ہے

اور اس کی شرح میں جہاں امیر مغری کے قصیدے کا ذکر کیا ہے ان کو اپنا بھی ایک قصیدہ یاد آ گیا ہے جو سر آسماں جاہ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد دکن کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے متعلق لکھا گیا تھا ۵

حالی کو اپنی مصنفات میں اپنی نظموں اور ذاتیات کے پیش کرنے کا کئی جگہ موقع ملتا تھا، لیکن ان کی فطری بے لوثی نے انہیں اس امر کی اجازت نہیں دی اس کی بعض مثالیں ذیل میں پیش کش ہیں۔

۱۔ مقدمہ شعر و شاعری میں جہاں انہوں نے گولڈ اسمتہ کی شاعری کی سرخی کے تحت اس کی ایک نظم کا اظہار کیا ہے، وہ اپنی اس نظم کو پیش کر سکتے تھے جو شعر کو مخاطب کر کے (گولڈ اسمتہ کی اسی نظم کے ترجمہ کے طور پر) لکھی گئی تھی۔ نیز اسی کتاب میں ان کی وہ نظمیں بھی کہیں نہ کہیں درج ہو سکتی تھیں جو دلی کی شاعری کے تنزل کے عنوان سے لکھی گئی تھیں ۵

۲۔ حیات جاوید اور یادگار غالب میں حالی کو کافی موقع تھا کہ وہ سرسید اور غالب کے ساتھ اپنی خانگی تعلقات کے متعلق ایک عنوان قائم کر لیتے۔ یا کم از کم کسی دوسرے عنوان کے ضمن میں ان کا ذکر کر دیتے۔

۳۔ حالی نے مرزا غالب کا جو عالی شان اور دردناک مرثیہ لکھا تھا وہ یادگار غالب میں غالب کی وفات کے ذکر کے ساتھ درج کیا جاسکتا تھا۔ نیز انہوں نے غالب کی جو تیارچہ وفات لکھی تھی اس کا ذکر بھی اس موقع پر بے جا نہ تھا۔

۴۔ حیات جاوید میں جگہ جگہ (متن میں یا حاشیوں پر) اس قدر موقع ملتا تھا کہ وہ اپنی ان تمام نظموں کو داخل کر سکتے تھے جو انہوں نے موقع بموقع سرسید اور ان کے کاموں کے متعلق لکھی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے دو سرودوں کی اس قسم کی نظمیں درج کی ہیں لیکن کہیں اپنی کوئی نظم نہیں پیش کی۔ ان کی جو نظمیں حیات جاوید میں کسی نہ کسی جگہ درج ہو سکتی تھیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) قصیدہ ناتمام۔ مرقومہ ۱۲۹۴ء سرسید احمد خاں کی شان میں (دیوان حالی صفحہ ۱۳۸)

(۲) قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۹ء جو حیدر آباد میں محمد ن کالج ڈپوٹیشن کی طرف سے پڑھا گیا تھا (دیوان حالی ۱۴۵)

۵ دیکو شعر اعجم حصہ اول صفحہ ۲۵ مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ۔

۵ دیوان حالی صفحہ ۱۳

۵ دیوان حالی صفحہ ۲۱ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔

۵ دیوان حالی صفحہ ۱۲۷

۵ دیوان حالی صفحہ ۱۸۰

۵ حیات جاوید دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۲۸۔ نظم مولوی صفدر حسین مرحوم

۵ حیات جاوید ۲۱۷۔ مغل علی محمد علی تاجو عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیے۔

اصغر علی محمد علی تاجو عطر

- ۳۔ قطعہ - مرتبہ ۱۳۰۹ء جو حیدر آباد میں محمد کالج ڈپوٹیشن کی طرف سے پڑھا گیا تھا۔ (دیوان حالی ۱۴۸)
- ۴۔ ترکیب بند - مرتبہ ۱۳۰۹ء جو ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں پڑھا گیا (دیوان حالی صفحہ ۱۵۰)
- ۵۔ تاریخ بنائے چاہ درحوالہ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کجمن سنی جناب آنریبل سرسید احمد خاں بہادر (دیوان حالی صفحہ ۱۸۴)
- ۶۔ ترکیب بند - مرتبہ ۱۳۲۰ء جو ایجوکیشنل کانفرنس دہلی میں پڑھا گیا (دیوان حالی صفحہ ۱۶۴)
- ۷۔ سید احمد خاں کی تکفیر (دیوان حالی صفحہ ۱۷۷)
- ۸۔ سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ (دیوان حالی صفحہ ۱۹)
- ۹۔ سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید (دیوان حالی صفحہ ۲۳)
- ۱۰۔ علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے (کلیات نظم حالی جلد اول صفحہ ۵۰)

اردو نثر میں حالی کا درجہ | حالی کی نثری خدمات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جس طرح عام طور پر انکو شاعری کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے اور ایک دبستان سخن کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ نثر کے لحاظ سے بھی ان کی مصنفات ادبیات اردو کے ایک جزو لاینفک ہیں اور ایسے جزو لاینفک جو ان کی شاعری کی طرح ادبیات اردو میں ایک نئے اور ضروری باب کے اضافہ کے باعث ہیں۔ اس وقت بھی جب کہ اردو کا سرمایہ نثر کافی ترقی کر چکا ہے اگر مولوی حالی کی نثری خدمات کو اس علیحدہ کر لیا جائے تو ایک ایسا فقدان نظر آئے گا جس کی تلافی شاید ہی متعدد انشا پردازوں کی متفہم کوششوں کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی کی نثری تصانیف ادبیات اردو کی بساط کے ایسے پوند ہیں جن کے بغیر اس کی بدنامی ہرگز نہیں چھپ سکتی۔

اگرچہ اردو نثر میں سب سے پہلے جدید طرز کی علمی و ادبی کتابیں لکھنے کا سہرا مولوی محمد حسین آزاد کے سر ہے لیکن ان کا اسلوب بیان کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ میٹھاری اردو کی کتابیں نہیں قرار دی جاسکتیں۔ آزاد اپنی تحریروں میں اس قدر بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ ہر جگہ اپنی ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ کے بغیر نہیں رہ سکتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حساس شخص خانگی ملاقات میں بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ یہی حال مولوی نذیر احمد کا ہے، وہ اس معاملہ میں ایک طرح سے آزاد سے بھی بڑھتے ہیں آزاد کی عبارتیں پڑھتے وقت یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر بے تکلف گفتگو کر رہا ہو لیکن نذیر احمد کی تحریروں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مصنف بازاروں اور گلی کوچوں میں چکر لگاتے ہوئے عوام سے بات چیت کر رہا ہے۔ حالی نے اپنے اسلوب کے ذریعہ ان دونوں زبردست خرابیوں کو دور کر دیا، اور سنجیدہ و علمی مضامین کو اس طرح لکھنا شروع کیا کہ پڑھنے والا ان سے مرعوب ہو جائے اور اس کو معلوم ہو کہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس قسم کے اسلوب کی اس زمانہ میں سخت ضرورت تھی کیونکہ یہ ایک رد عمل اردو کی ان پرانی طرز کی تحریروں کا جن میں مواد اور کام کی باتیں تو بہت کم ہوتی تھیں لیکن لفظی خوبیوں اور ظاہری صنایعوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا، یہ حالی جیسے سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق رکھنے والی ہستی ہی کا کام تھا کہ جہاں اردو کو ایک طرف بجا جکر بندیوں سے نکالنے کی کوشش کی دوسری طرف اس امر کا بھی لحاظ رکھا کہ وہ بالکل آزاد ہو کر بازاری اور متبذل نہ بنے پائے۔

اسلوب کی خوبی کے علاوہ حالی کی نثری مصنفات نوعیت موضوع و مضامین کے لحاظ سے ان کے ہم عصروں میں ان کو ممتاز رکھتی ہیں یہ پہلے اہمیت

یہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے تنقیدی خیالات کو اردو میں روشناس کرایا۔ حالی سے قبل اردو کے کسی انشا پرداز نے بھی اس طرح غیر جانبدارانہ تنقید نہیں پیش کی تھیں۔ اگرچہ آزاد نے اب حیات میں اس فرض کو انجام دینا چاہا ہے، لیکن ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتے، وہ جگہ جگہ اپنے ذاتی معقدات سے کام لیتے ہیں اور اس بات پر غور کرنیکی کوشش نہیں کرتے کہ میں کس کے ساتھ انصاف کر رہا ہوں، اور کس کے حق میں ظلم؟ مولوی نذیر احمد تو اس مرد کے میدان ہی نہیں۔ برخلاف ان دونوں کے حالی کو قدرت کی جانب سے ایک تنقیدی دماغ عطا ہوا تھا۔ اگرچہ انہوں نے فن تنقید پر کچھ نہیں لکھا، لیکن وہ انشا پردازوں کا بالمقابلہ مطالعہ کرتے میں خاص طور پر اعلیٰ مذاق سے کام لیتے تھے غیر جانبدار تنقیدی خیالات کی جس قدر فراوانی ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے، اس زمانہ کے کسی اور انشا پرداز کی مصنفات میں نہیں پائی جاتی، یہی وہ زبردست امتیاز ہے جس کے باعث حالی نے اردو ادب میں ایک اہم رتبہ حاصل کر لیا ہے اور جس کے اثر سے آج تک اردو کے تنقید نگاروں کی خاص رہبری ہوتی رہی ہے۔

اردو شعرا نے جہاں حالی کی نئی طرز کی نظموں کو آنے والی شاعری کے صحیح نمونے سمجھ کر ان کی تقلید کرنی شروع کی ان کے دیوان کے دیباچہ اور مقدمہ کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم کیا کہ یہ نمونے کیا اہمیت رکھتے ہیں اور ہم کو ان کی تقلید کس طرح کرنی چاہیے؟ اگر حالی کی نظمیں ملک و قوم کے سامنے ان کے نثری مقدمہ اور دیباچہ کے بغیر پیش ہوتیں تو ان کا اثر اردو کے شاعروں پر اس قدر دیر پا نہ ہوتا۔

حالی نے نہ صرف نمونے پیش کر دیے، بلکہ ان نمونوں کو آئینہ والی نسلوں کے لئے چراغ راہ بنانے کی خاطر ان کی خوبیوں ضرورت اور اصولوں پر بھی روشنی ڈال دی، اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد نے بھی اس قسم کے نمونے ضرور پیش کئے ہیں، اس میں اولیت کا فخر انہیں کو حاصل ہے اور ان کی بعض نظمیں حالی کی بعض نظموں سے یقیناً بلند پایہ قرار دی جاسکتی ہیں لیکن وہ اتنی مقبول نہ ہو سکیں جتنی حالی کی نظمیں ہوئی ہیں۔ حالی نے ایک اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچ کر عام روش کے خلاف نہ صرف ایک زور دار اور انوکھی آواز بلند کی ہے بلکہ آواز سن کر ان کی طرف متوجہ ہونے والوں کے لئے ایسے نقش قدم بھی چھوڑ دیے ہیں جن پر چلنے کے بعد ہر شخص اس اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں سے حالی نے صدا دی تھی۔

تنقید نگاری کے بعد حالی کا زبردست نثری کارنامہ ان کی سوانح عمریاں ہیں۔ جس طرح اردو تنقید نگاروں میں ان کو اولیت کا رتبہ حاصل ہے سوانح عمری کو روشناس کرانے میں بھی حالی سب سے پیش پیش ہیں، فن سوانح نگاری اگرچہ مشرق کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن حالی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے یورپ کی جدید ترین طرز سوانح نگاری کے مطابق ہندوستان میں ٹھیک سوانح عمریاں لکھنی شروع کیں۔ مورخانہ تدقیق، حالات و واقعات سے منطقی طور پر نتیجوں کا استخراج اور جس کی سوانح عمری لکھی جائے اس کے کارناموں اور زندگی میں غور و خوض کرنے کی ابتدا حالی ہی نے کی اور ان کے بعد اردو کے جس قدر انشا پردازوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی ان سب کو غیر ارادی طور پر حالی ہی کی تقلید کرنی پڑی اس بارے میں علامہ شبلی عسکری جیسی ہستی بھی حالی کی خوشہ چیں نظر آتی ہے۔ اگرچہ شبلی کا دائرہ عمل اسلوب بیان اور نوعیت مضامین دونوں کے لحاظ سے حالی کے جولا نگاہ سے بہت زیادہ دھچپ اور وسیع تھا لیکن جب انہوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی تو انہیں بھی حالی کی پیش کردہ نمونہ کو اختیار کرنا پڑا یہ حالی کی صحت مذاق کی دلیل ہے کہ شبلی جیسا بلند پایہ شخص بھی انہی کے اصول پر کاربند ہوتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے اردو نثر میں حالی کی اہمیت ایک خاص انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

حالی دنیا کی ان خوش قسمت ہستیوں میں سے تھے جو اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کو اپنی آنکھوں سے پروان چڑھتا ہوا دیکھ کر فخر حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جس قدیم پیرایہ تحریر کا رد عمل شروع کیا تھا وہ ان کی زندگی ہی میں حرف غلط بکھر چکا تھا۔ ان کی نئے رنگ کی قلموں نے انہی کے سامنے پڑانے اور بد وضع رنگوں کی شاعری کو اپنے وسیع دامنوں میں محو کر لیا۔ ان کے ثقہ اور سنجیدہ تنقیدی خیالات نے ایک طرف تو قدیم بے راہ روی اور بد مذاقی کے خرمینوں کو بجلی بن کر جلا دیا اور دوسری طرف بوستان علم و ادب کے نو نھالوں کو ابرنیاں بن کر سرسبز و شاداب بنا دیا۔

اس کا مگار انسان کی مسرت و اطمینان کی کوئی حد بھی ہو سکتی ہے جس نے اپنی جوانی میں جن کاموں کے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا ان کو اپنے بڑھاپے تک فتح مند ہی کے ساتھ انجام کو پہنچا دیا ہو!!
اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے اور اپنی امیدوں کو بار آور پانے کے بعد اگر حالی کو وہ اطمینان و سکوت نصیب نہ ہوتا جو ان کی آخر عمر میں انکو حاصل ہوا تھا اور جس کے بعد انہوں نے کوئی بڑا ادبی کام نہیں پیش کیا تو فطرت کی اس سے بڑھ کر احسان فراموشی اور ناقدر دانی کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

سید محی الدین قادری زور بی اے

لسان الغیب حافظ شیرازی کی مکمل سوانح عمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اول تین روپیہ جلد دوم عام
کاس الکرام۔ عمر و خیام کے مفصل حالات زندگی اور رباعیات کی مکمل شرح، اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے قیمت ۴
نمک ان فصاحت۔ فارسی عربی، اردو کے بہترین علمی، ادبی، تاریخی لطائف قیمت ۴
بندگی۔ امام بن تمیم کی مشہور کتاب "الہودیت" کا ہمیشہ ترجمہ حقایق دینی و تصوف کی بے نظیر کتاب قیمت ۴
مطالبہ فطرت (مجلد) مصنفہ محمد فاروق ام۔ اس۔ سی، فلسفہ اسلام پر ہمیشہ کتاب قیمت ۴
سالومی، اسکر و املط کے نہایت مشہور ڈرامہ کا ہمیشہ اردو ترجمہ قیمت ۱۲
فتنہ خلق قرآن امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب الجیدہ کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بے نظیر محاکمہ ۱۰
حلقہ مسموم۔ کینن ڈائل کے علمی فسانہ کا اردو ترجمہ ۴
جہاں آرا بیکم۔ شاہزادی جہاں آرا بیکم کی نہایت مستند و دلچسپ تاریخ ۸
تذکرہ بھٹے شاہ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے ۸
بادہ ناب۔ فارسی رباعیات مصنفہ میر ولی التری۔ اے ۴
یادگار غالب۔ قیمت تین روپیہ
کلیات عالی نظم، قیمت ۴

منیجنگ کاربوریٹل سے طلب فرمائیے

لیلیٰ و مجنون

من شکی البلوی فقہ ضل الطرق

(برکات شیخ الشیوخ استاد الاساتذہ حضرت مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی رح) یہ نظم اس وقت کی یادگار ہے جب مولانا شبلی اعظم گڑھ میں حضرت شیخ رحم سے پڑھتے تھے، فلسفہ کی کوئی کتاب اس میں تھی، مولانا کے ایک ہم سبق نے حضرت شیخ رحم سے اپنے ایک مہربان قدیم کی شکایت کی، حضرت شیخ رحم نے یہ نظم فی البدیہہ لکھ کر شکایت کرنے والے کو رضائے دوست کے سامنے تسلیم خم کرنے کی تعلیم دی۔

آن شنیدستی کہ لیلیٰ بیشتر بذل کردے برگدایاں سیم دزد
بر در آن ماہوش از ہر طرف آمدندے سائلان کاسہ بکفت
روز کے مجنوں ہم آن شوریدہ حال بر در آن ماہ شد بہر سوال
دیر جوش برگدایاں پیش و پس گرد لیلکے شکر لب چوں گیس
داخل آن جمع گشت و گرد پیش کاسہ در یوزہ را چوں چشم خوش
دید چوں آن ماہ کاں شوریدہ حال شد بجمع سائلان بہر سوال
از تغافل تافت رخ زان خوش نظر برگدایاں گشت بجز بذل زر
دامن سائل نمود آن سیم دزد ہر طرف چوں چشم مجنون بگرد
چوں باختر نوبت محسنوں رسید دل دروں سینہ عاشق تپید
بود حیران جمال آن صنم، فارغ از اندیشہ لطف و ستم
آتش سودائے قیش چوں گرفت کاسہ را خود از کف مجنوں گرفت
برز میں زد کاسہ و شکست خرد قیس دندان ہوس بر دل فشر د
شد فروختے بہ غرقاب خیال بعد ازاں شد از فرج در و جد محال
ہر کہ دید آن حال گفتائے شکفت جائے گریہ خذہ ات چوں در گرفت
گفت مجنوں بایکے زان کا رفیق من شکی البلوی فقہ ضل الطرق

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیے

ہر کہ خورد از جفاے دوست نیست در طریقت آشنای دوست نیست
 ہر چه از یاد آید از جور و ستم گشت بر ما شد و بر بگیا نہ ستم
 خرم آن ساعت کہ آن تابندہ باہ از تغافل ساخت با ضبط نگاہ
 لے خوش آن ساعت کہ کرد آن گم گردن مازیر شمشیر ستم
 قتل و ذبح از مے نہ در کلفت است عید قرباں اہل الفت است
 جفا صیدے کہ تیغ آن صنم
 بر گلوے او کند مشق ستم

مرلہ (کیفنی چربا کوٹی)

درود (کا کوروی)

گل بقطار یکطرف رقص ہزار یکطرف روئے نگار یکطرف حسن بہار یک طرف
 مست جمال حق ہمہ بخود دے رقص ہمہ عقل زکار یکطرف صبر قرار یک طرف
 نگہ لطف چوں رسید پردہ برد خود کشید باد ہنسار یکطرف مشک تار یک طرف
 باز ز قلب خستہ تن برد شکیب و صبرین زلف نگار یکطرف چشم خمار یک طرف
 یار پے جفاے تو ہر چه بود فدائے تو این دل زار یکطرف جان نگار یک طرف
 جلوہ طلعت ازل تافتہ است بر محل روئے نگار یکطرف شکن بہار یک طرف
 این دل بقرار خود ماند زکار و بار خود ذوق خمار یکطرف جلوہ یار یک طرف
 در رہ عشق دمدم آفت جان قدمم ظلم نگار یکطرف عشوہ یار یک طرف
 درد بحال زار من گریہ کنان بہ ہر من
 ایر بہار یکطرف شمع مزار یک طرف

”نظر“ کا سالانہ منبر

بڑی تقطیع کے پانچ جزد پر کم و بیش میں عمدہ تصویروں کے ساتھ جنوری میں شایع ہوگا، غیر خریدار کو ۱۲ میں ایک کاپی ملیگی۔ مینجر ”نظر“ لکھنؤ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر مل سکتا ہے

خواب

(افسانہ)

شاہد کل صبح آٹھ بجے کی گاڑی سے ”پرشوتم پور“ جانے والا تھا، آدھی رات گزر گئی تھی، نجمہ ابھی تک جاگ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور نہ دل میں سونے کی خواہش، شاہد آرام سے سو رہا تھا، لیکن نجمہ اس کے قریب لیٹی لیٹی اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

نجمہ کی شادی کو آج صرف پانچ دن ہوئے تھے چونکہ شاہد کو بہت جلد اپنی نوکری پر چلا جانا تھا، اس لئے شادی کی تمام رسمیں جلد جرحم کر دی گئی تھیں، شاہد کے جانیے بعد نجمہ بھی اپنے میکے چلی جانے والی تھی، شادی سے پہلے نجمہ نے شاہد کو دیکھا کیا اس کا کہی نام بھی نہ سنا تھا، لیکن اللہ نے عقل اور والدین نے تعلیم دی تھی اس سے نجمہ اپنے انجان شوہر پر فدا ہونے کو پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی رسم دروچ کے مطابق ماں باپ نے نجمہ سے پوچھا بھی نہ تھا اور جانتی تھی کہ اس کی شادی کہیں خاندان سے باہر ہونی والی ہے، اسے اس کا بھی یقین تھا کہ ایسے اہم مسئلہ میں جس پر اس کی آئندہ زندگی کا سارا انحصار تھا، کوئی اس سے پوچھ گیا بھی نہیں، اس لئے نجمہ اپنا دل پہلے ہی سے شوہر کو نذر کر چکی تھی؛

نجمہ کے والد مولوی اظہار حسین نے اپنی بیٹی کی تعلیم میں بڑی کوشش کی تھی اسے کسی اسکول میں تو نہ بھیجا تھا، لیکن شفیق باپ نے خود جو کچھ معلوم تھا اپنی اکلوتی بیٹی کو پڑھا دیا تھا۔ اگر نجمہ بی۔ اے باپ کی شاگرد تھی تو شاہد بھی کسی طرح کم نہ تھا امپریل کالج لندن سے اے۔ آر۔ اس۔ ام اور ڈی۔ آئی۔ سی کا ڈپلوما لیکر ہندوستان واپس آئے ہوئے ابھی صرف پندرہ مہینے گزرے تھے ایک سال سے شاہد کلکتہ کی مشہور کمپنی پرشوتم داس ٹھاکر داس کے بڑے آہنی کارخانہ میں تلاش معدن کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھا، تنخواہ بھی معقول تھی، بھتے کے علاوہ ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار اور پھر ترقی کی امید، شاہد کے والد امیر تو نہ تھے مگر ماں گھر کے خوش حال کہاتے پیتے لوگ تھے اور اصل تو یوں ہے کہ نہ تو مولوی اظہار حسین ہی کے پاس روپیہ تھا نہ عابد حسین کے پاس دونوں نے جو کچھ کمایا تھا بچوں کی تعلیم میں صرف کر دیا تھا، تھوڑی سی جائداد پر آرام سے سفید پوشی کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔

شاہد کو اپنی بیٹی دینے پر مولوی اظہار حسین کو شروع میں کچھ تامل ہوا تھا، کیونکہ اول تو شاہد کا دطن لطیف گنج روشن آباد سے بہت دور تھا۔ اکلوتی بیٹی کو اتنی دور بیاہ دینا مشکل سے دل گوارا کرتا تھا، اور دوسری بات شاہد کی نوکری تھی وہ معدن میں کام کرتا تھا اور اس لئے ہر وقت صحرانی جانوروں، درندوں اور حادثات کا ڈر تھا۔ اکثر اجاروں میں لوگوں کے ہلاک ہونے کی خبریں بھی آجاتی تھیں۔ کچ آسام میں فلاں چائے کے کاشتکار انگریز کو شیر نے کھا ڈالا۔ کل فلاں افسر ہاتھی سے کچل گیا۔ پرسوں فلاں ریلوے انجن کو ریکھنے نے پٹج ڈالا۔ اس لئے پہلے مولوی اظہار حسین کو کچھ تامل تھا۔ لیکن بہرہ و سہ کر کے راضی ہو گئے۔

نجمہ کو ان سب باتوں کی خبر تھی اور ان پانچ دنوں کی ملاقات اور ہزاروں رسموں سے فرصت پانے کے بعد جو کچھ گفتگو ہو سکی اسی کے دوران میں شاہد نے

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدر آباد دکن میں بھی ہے

نجمہ کو اپنی پوری حالت، کام کے خطرے اور اُن کی مشکلات اور پریشان و نمک کے لئے ایسے کاموں کی ضرورت سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا، نجمہ لکھی پڑھی تھی سب سمجھ گئی اور اگر لکھی پڑھی نہ ہوتی تو میکے سے اتنی دور میا ہی کیوں جاتی۔

شب کے کہانے کے بعد نجمہ نے شاہد سے رکتے رکتے کہا کہ بیوی کا فرض ہے کہ وہ شوہر کی ہر مصیبتوں میں اس کے ساتھ رہے، ممکن ہے کہ صرف پانچ راتوں کی میا ہی نجمہ اپنا مطلب اچھی طرح نہ ظاہر کر سکی ہو کہیں شاہد نے اس کا مدعا سمجھ لیا اور مسکرا کر کہا ”واہ! تم ساتھ رہو تو ہر کام ذرا برابر ہی نہ ہو، میں مرد ہوں کسی نہ کسی طرح جھیل لیتا ہوں لیکن جنگل میں اور تم! اور پردہ؟“ نجمہ اس کا جواب کیا دیتی ہاں صرف اتنا کہ سکی کہ ”جنگل میں پردہ کی کیا ضرورت ہے“ نجمہ یہ چند الفاظ مشکل سے ادا کر سکی، کیونکہ جی ہوا کرتا تھا اور شاہد کے رنجور ہونے کے ڈر سے آنسو پی پی کر ضبط کر رہی تھی؛ اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں اور شاہد سو گیا۔ نجمہ البتہ جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاہد کل نوکری پر جانوا لا ہے اور دس بارہ مہینے سے پہلے اُس کے واپس آنے کی امید بھی نہیں؛ نجمہ رہ رہ کر جانتی تھی کہ شاہد سے لپٹ جائے اور خوب روئے لیکن جانے اجازت نہ دی پر جنگل کے خطروں کا خیال آگیا اور نجمہ یہ سوچ کر کانپنے لگی لیکن پر خود ہی اس طرح تسکین کر لی کہ داد یہ کیا ضروری ہے کہ شاہد ہی کو نصیب دشمنان کچھ ہو جائے آخر اور لوگ بھی تو وہاں رہتے ہیں غرض یہی خیالات نجمہ کو سونے سے روک رہے تھے، کبھی محبت کی انگ سے چہرہ گلنا رہو جاتا اور کبھی فرقت کی مصیبت سے آنکھیں ڈبڈب جاتیں سینہ دھڑکنے لگتا دو بجے تک نجمہ اسی ادھیڑ میں پڑی رہی، یکایک شاہد نے کروٹ لی نیند میں تکیہ سیدھا کیا اور ایک ہات پھیلا کر سوراخ بنانے اپنا سر شاہد کے بازو پر رکھ دیا اور خود بھی سو گئی۔

نجمہ دیر سے شاہد کی راہ دیکھ رہی تھی، کبھی کان لگا کر سنتی، کبھی اٹھ کر ٹٹلنے لگتی، کبھی گور کر کہا سپاہی کو بلا کر پوچھتی کہ صاحب کو آج اتنی دیر کیوں مچنی دن کے دو بج گئے تھے آفتاب میں وہ حدت تھی کہ انسان کا دھوپ میں دو قدم چلنا محال تھا، شاید صبح پانچ بجے سے جنگل کے اندر گیا ہوا تھا لیکن اب دو بج گئے تھے اور اس کا کہیں پتہ نہ تھا، شاہد کے ساتھ صرف چھ جنگلی اور اُن (چھوٹا ناگپور کی جنگلی قوم) (Dumak) تھے ایک رائفل اور پانی کی مارجی ساتھ تھی۔ جوار میں دو آدم خوار شیروں نے چند دنوں سے اودھم مچا رکھی تھی۔ شب کے وقت خیموں کے ارد گرد اُن کی ڈکار سنی جاتی تھی۔

کچھ دیر تو نجمہ نے سوچا کہ شاہد کو شاید کسی معدن کا سرخ ملا ہو گا اور وہ آگے بڑھ گیا ہو گا، لیکن نجمہ شاہد کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی سرخ ملتے ہی شاہد اُس کے پاس چلا آتا۔ اُس کی رائے لیتا، رسم و رواج اور خاندان والوں کے خلاف شوہر کی محبت میں نجمہ اُس کے ساتھ جنگل میں چلی آئی تھی اور اس محبت کے بدلے شاہد بھی اُسے صرف اپنی بیوی ہی نہیں بلکہ اپنا سچا دوست اور مشیر سمجھتا، ہر بات میں اس سے رائے لیتا اور باہمی فیصلہ پر عمل کیا جاتا۔

بارہ بجنے کے بعد جوں جوں دن ڈھلتا گیا، نجمہ کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ آخر نجمہ نے اپنے چوڑی دار پاجامہ پر بوزہ پہن کر بوٹ پہن لئے، کمرے پوالوہ پاندہ لیا، رائفل بھری، کار تو سوں کا بار لگے میں ڈال لیا، گور کے سپاہیوں کو آواز دی، ان کی رائفل بھروائی، لکڑی بندھوائی، پانی کی چھاگلیں دو قلیوں کے حوالے کیں، کوٹ کے جیب میں دو اداؤں کی چند شیشیاں اور دو ایک پٹیاں رکھ لیں، اور جیب سب تیار ہو چکی تو انتشار

کے ساتھ خیمہ کے اندر ٹھلنے لگی۔ خود بخوبی کو معلوم نہ تھا کہ آخر یہ تیاریاں اس نے کس لئے کی تھیں، وہ بتانہ سکتی تھی کہ آخر اسے کس چیز کا ڈر تھا، لیکن دل کے اندر کوئی چیز کھٹک رہی تھی اور ضمیر کہہ رہا تھا کہ شاید کہیں خطرے میں ہے۔

بخمہ کا انتشار بڑھ ہی رہا تھا کہ جنگل سے ایک اڑاؤن قلی چلا آتا ہوا نکلا، قلی کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور اس کی ران سے خون جاری تھا، اپنی زبان میں وہ کہہ تو بہت کچھ گیا مگر تجربہ صرف اتنا سمجھ سکی کہ شاہد پر شیر نے حملہ کیا تھا اور ایک فیر کے بعد شیر نے جھپٹ کر شاہد کے ہاتھ سے رائفل گرا دی تھی۔ اس کے بعد بخمہ نے کچھ سنا اور نہ دماغ نے کچھ اور سوچنے کی ہمت دی، فوجی کمانڈر کی طرح کڑک کر بخمہ نے چاروں گورکھوں کو پکارا، سہرے شاہد کی ایک ٹوپی رکھ لی اور رائفل کا ندھے پر رکھ کر خیمہ سے نکل کھڑی ہوئی۔ آگے دو گورکھ ننگین چڑھائے رائفل کا ندھے پر رکھے پیچ میں بخمہ پیچھے دو گورکھ اور ان کے بعد بارہ پندرہ اڑاؤن کمان اور بہائے سنبھالے جنگل میں گھس گئے، شاہد نے جاتے وقت جگہ جگہ پر درختوں کی ڈالیاں کٹوا دی تھیں جس سے اسے راستے کا پتہ ملتا تھا، دھوپ سخت پڑ رہی تھی اور پیاس سے بخمہ کی زبان انیٹھی جارہی تھی، سہرے وہی وہی شیرنی کی طرح ہر سو نگراں جلد جلد قدم بڑھاتی چلی جارہی تھی نصف گھنٹہ چلنے کے بعد سہرے قلی ایک پہاڑی پر چڑھنے لگا، سہرے کی محبت میں بخمہ اگر جنگل میں نکل آئی تھی تو کیا، آخر سہرے ہی ناز و نعم کی پٹی ہوئی تھی؛ یہاں تک آتے آتے سانس چڑھ گئی تھی۔ پیاس سے بڑا حال تھا پاؤں تل ہو گئے تھے اور پہاڑی کی چڑھائی نے سہرے ہی طاقت کی ددی تھی، چند قدم آگے چل کر بخمہ نے ٹٹو کر کھائی، پتھر پر گر کر منہ ہات چورا ہو گئی ہوئی، لیکن وفادار گورکھ شاید اس کے لئے تیار تھے، ہو کر کھا کر بخمہ کا آگے جھکنا تھا کہ پیچھے کے گورکھ نے سنبھال لیا۔ بخمہ کے پاؤں میں سخت جھوٹ آئی اور وہ دفعتاً غش کر گئی منہ پر پانی چھڑک کر بخمہ کو ہوش میں لائے۔ ہوش میں آتے ہی بخمہ اٹھ کھڑی ہوئی اور رن بہادر کا ہاتھ پکڑ کر بولی ”رن بہادر، صاحب کی جان خطرے میں ہے“ بوڑھا گورکھ کھانسی لڑائیوں میں لڑا ہوا تھا، مگر شریف عورت کی پکار سے اس کا دل بھی ہل گیا؛ اور وہ جانتا تھا کہ بخمہ اب ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہ تھی، گورکھ نے جھک کر بخمہ کو اٹھا کر کا ندھے پر ڈال لیا اور ”آؤ بھائیو!“ کہہ کر ساتھ والوں کو لٹکارتا ہوا پہاڑ پر چڑھنے لگا۔

گورکھ اور قلی جلد جلد پہاڑ پر چڑھ گئے، آگے والا قلی تھم گیا، ابھی تک راستہ کا پتہ تھا لیکن یہاں کے بعد کہیں درخت کٹا ہوا نہیں تھا، گورکھ اور قلی چاروں طرف پھیل کر شاہد کو ڈھونڈنے لگے، رن بہادر بھی ایک ہاتھ سے بخمہ کو سنبھالے دوسرے ہاتھ میں رائفل لئے ادھر ادھر ہٹ رہے تھے دس منٹ کی تلاش کے بعد بھی شاہد کا کہیں پتہ نہ ملا۔ گھنے جنگل میں قدم قدم پر درندوں کا خوف تھا۔ شیر، بچھ، سور، بکشت تھے ہاتھی کے جھنڈ بھی کہیں قریب ہی رہا کرتے تھے، سانپ، بچھو کی انتھانہ تھی، ان بڑے جانوروں کے علاوہ مچھر اور چوٹی چھوٹی مکھیاں زندگی دوہرے ہوئے تھیں۔ اور اس پر طرہ یہ تھا کہ آفتاب آج گرم ہو رہا تھا، زمین جل رہی تھی، اور چونکہ درختوں کے تپے جھڑ گئے تھے اس لئے دھوپ سے کہیں بچاؤ نہ تھا رن بہادر اور اس کے ساتھ والے گو بہت سی لڑائیاں لڑے ہوئے تھے مگر اب ان کے بھی ہاتھ پاؤں نے بھی جواب دیدیا تھا کر دیا تھا، لیکن صرف ان کی بہادری انہیں آگے لئے جارہی تھی۔

شاہد کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک بڑے چٹان کے قریب پہنچے تو شیر کی بو معلوم ہوئی، بوڑھا فوجی وہیں رگ گیا، اور بخمہ کو کا ندھے سے اتار کر بولا ”بی بی یہاں کہیں شیر ہے، ڈرو نہیں، رائفل کا گواڑا چڑھا لو اور آہستہ آہستہ چلو“ بخمہ تھی کمزور مگر شاہد کی محبت اسے بہت بہادر بنائے

ہوئے تھی، ہاتھ میں رائفل سنبھا لکر نجمہ رن بہادر کے ساتھ شکاریوں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھی، شیر کی بو بڑھ رہی تھی، چند قدم اور آگے چلکر رن بہادر نے نجمہ کی طرف دیکھ کر لبوں پر انگلی رکھ لی، دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے، سامنے ایک شیرنی پڑی غراہی تھی، شیرنی کے پیٹھ سے خون جاری تھا، شاید وہیں گولی لگی تھی۔ نجمہ اور رن بہادر شیرنی سے نظر پکارتے ہوئے آہستہ آہستہ کھسک کر اس طرف پہنچے جہاں پہاڑ ختم ہو گیا تھا، اور جہاں سے تین سو فٹ نیچے ندی بھتی تھی، جہاں نجمہ تھی، وہاں سے ندی تک اتنا بہت مشکل تھا۔ دریا کے کنارے، پتھر کے ڈھیلے اور چٹان پڑے تھے، پہاڑ کے نیچے شیروں اور بچھوں کے بھٹاتے تھے، نجمہ نے دیکھا کہ شیرنی غرا کر پہاڑ کے دامن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ لیکن زخمی ہونے کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی، شیرنی سے کوئی چار گز کے فاصلہ پر ایک چٹان دریا کی طرف نکلی ہوئی تھی جس کا ایک کونہ پکڑے شاہرہ ندی کی طرف لٹک رہا تھا، شاہرہ کے شانوں سے خون بہہ رہا تھا اور قمیض پٹی ہوئی تھی رائفل توڑی دور آگے پڑی تھی، شیر نے نال کو چاڑھا تھا۔ شیرنی رہ رہ کر غرا کر شاہرہ کی طرف بڑھتی تھی۔

معلوم نہیں کہ شاہرہ کتنی دیر سے اس طرح لٹک رہا تھا، اب اس کی طاقت گھٹ رہی تھی ہاتھ کانپ رہے تھے، شیرنی کے قریب پہنچنے کے معنی زندگی کا اختتام تھا۔ پہاڑ سے گزنا بھی موت کے منہ میں جانا تھا، دریا سے کچھ اور پر ایک بڑا شیر شاہرہ کے انتظار میں غرا کر دم ٹپک رہا تھا۔ ان کی آن میں نجمہ سب حالت سمجھ گئی، دماغ کے کل پرزے فوراً کام کرنے لگے، نجمہ نے جھک کر رن بہادر کے کان میں کچھ کہا اور دونوں رائفل سنبھال کر الگ ہو گئے، دونوں نے بندوق سینے سے لگا لی، نشانہ کیا، سانس روکی اور ساتھ ہی دو فیر ہوئے، زخمی شیرنی رن بہادر کی گولی کھاتے ہی ٹھنڈی ہو گئی اور نجمہ کی گولی سے پہاڑ کے نیچے کا شیر بھی ڈھیر ہو گیا۔ مگر یکایک بندوق کی آواز ہونے سے شاہرہ کا ہاتھ چھٹا اور وہ دریا کے کنارے ایک چٹان پر گرا، نجمہ اپنی بدحواسی میں کسی طرح گرتی پڑتی شاہرہ کے قریب پہنچی، شاہرہ کا سر پھٹ گیا تھا اور اب ہچکے لیکر دم توڑ رہا تھا، نجمہ شاہرہ سے لپٹ کر دیوانہ دار چلانے لگی ”شاہرہ، شاہرہ، پیارے شاہرہ! بولو، خدا کے لئے بولو، شاہرہ مجھے بھی ساتھ لے لو،“ شاہرہ دم توڑ رہا تھا اور نجمہ اسے پکار رہی تھی۔

اب کیا ہوا؟ نجمہ! نجمہ! چونکو! ہشیار ہو، نجمہ، نجمہ، کیا نہیں دیکھ رہی ہو؟ چونکو!!!
نجمہ نے دیوانہ وار آنکھیں کھولیں، ادھر ادھر دیکھا اور پھر شاہرہ سے چپٹ گئی۔ نجمہ دیر تک سسک سسک کر روتی رہی، آنسوؤں سے سارا چہرہ تر تھا، پسینہ سے بدن پر کپڑے چپٹ گئے تھے، نجمہ کا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ شاہرہ دیر تک اس سے دلہی اور پیار کی باتیں کرتا رہا، کچھ دیر کے بعد گلاس میں پانی لاکر نجمہ کو پلایا، تولیہ بھگو کر منہ پونچھا اور پھر خواب کی حالت پوچھی، نجمہ نے رک رک کر سب حالت بیان کی، شاہرہ نے کہا تم یہ خواب دیکھ رہی تھیں اور میں یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک پہاڑ کی چوٹی سے تیز روشنی پھیل رہی ہے اور میں تمہارا ہاتھ پکڑے ہوئے اس طرف چڑھ رہا ہوں۔

شاہرہ نجمہ جنگل میں سرور زندگی بسر کر رہے ہیں اور اب انھیں شیر کا ڈر ہے، اور نہ تھائی کا خوف۔

سید علی اکبر کاظمی (بی۔ اے کتب)

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاج عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

ظہیر الدین محمد بابر

(ولادت ۱۴۸۲ء وفات ۱۵۳۰ء)

ترک باری ابن انفاط سے شروع ہوتی ہے ” میں بارہویں برس کی عمر اور رمضان المبارک کے مہینہ میں فرغانہ کا بادشاہ ہوا، یہ ملک آبادی دنیا کے انتہائی حد پر پانچویں اقلیم میں واقع ہے اس کے مشرق میں کاشغر اور مغرب میں سمرقند واقع ہیں۔ فرغانہ کی مالگزاری ملک پر بغیر جبر کے ہوئے تین چار ہزار سپاہ رکھنے کے لئے کفایت کرتی ہے یہ ملک وسعت میں کم ہے لیکن اس میں غلہ اور میوہ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں ” ان میں خرپڑہ نہایت پسندیدہ اور خاص پہل ہے، چنانچہ مرتے وقت تک بابر نے اپنے وطن کا خرپڑہ یاد رکھا۔ فرغانہ اپنے یہاں کے ممتاز علماء دین اور شعرا کی وجہ سے جیسا کہ آگے چلکر ہم بیان کریں گے بہت مشہور تھا۔ فرغانہ منجملہ ان بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ایک ریاست تھی جس میں تیمور کی وفات کے بعد اس کے مقبوضات تقسیم ہو گئے تھے۔ یہ ریاست بابر کے باپ کے حصہ میں آئی تھی ” جو ایک بلند حوصلہ شاہزادہ ” پکا مسلمان، علوم کا سرپرست، خود شاعر اور شعرا کا دوست تھا، اس کو فردوسی کے مشہور شاہنامہ سے بہت دلچسپی تھی جس میں شجاعت کے کارنامے درج ہیں۔

یہ بادشاہ اپنے انصاف کی وجہ سے مشہور آفاق تھا۔ بابر اس کی مصفت مزاجی کی ایک عجیب مثال کہتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ اسے خود بھی رد پیہ پیہ کی زیادہ ضرورت تھی شمالی چین کا ایک قافلہ اس کے پایہ تخت کے قریب برت میں تباہ ہو گیا۔ باوجود اپنی ضرورتوں کے اس نے سارا سامان تجارت نہایت احتیاط کے ساتھ رکھوا دیا تھا۔ یہاں تک کہ برس دو برس بعد ان سوداگروں کے درنا اس کے شہر میں آئے اور اپنا اسباب بچہ اس کے ہاتھوں سے واپس پایا۔ بابر کہتا ہے کہ ” اس کی فیاضی بہت بڑھ ہی ہوئی تھی ” اسی طرح پر اس کی روح تھی، وہ نہایت نیک مزاج، بامروت اور شیریں زبان تھا تاہم وہ دلیر اور اس کے ساتھ مردانہ تھا۔

اس کے اتفاقاً انتقال کر جانے پر بابر اس کا بیٹا جو تیمور کی نسل میں چھٹیوں پشت میں تھا تخت پر بیٹھا جس کی وجہ سے اسے اپنے مخالف بہائیوں سے

۱۵ روز بخشنہ نیم رمضان ۹۹۰ھ ہجری

۱۶ ایشیائی روس میں واقع ہے جو کان صدر مقام ہے۔

۱۷ چینی ترکستان واقع وسط ایشیا کا خاص شہر آبادی سولہ ہزار

۱۸ روسی ترکستان کا ایک صوبہ نہایت خوبصورت عمارات کے آثار اب تک موجود ہیں جن میں وسط ایشیا کی بہترین مسجد اور مقبرہ تیمور قابل دید ہیں۔

۱۹ سلطان محمود غزنوی کے دربار کا مشہور آفاق شاعر جس کی رزمیہ تاریخ شاہنامہ کو ابن اثیر نے قرآن العجم لکھا ہے۔

۲۰ بابر کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے۔ ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ کورکان بن سلطان محمد سعید کورکان بن سلطان محمد میرزا بن میرزا شاہ میرزا ابن امیر تیمور کورکان صاحبقران

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا تارکاتہ صرف ” خاکانی ہے “

لڑنا پڑا اور بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرنی پڑی۔ بابر کی ماں یونس خاں کی لڑکی تھی جس کا سلسلہ نسب براہ راست تیرہویں پشت میں خلجی خاں تک پہنچتا ہے، بابر لکھتا ہے: "داکٹر لڑائیوں اور محلات میں وہ میرے ساتھ رہی ہے" بابر کی نانی صاحبہ الہ اسے اور ایک غیر معمولی اثر کی عورت تھی۔ "بہت کم ایسی عورتیں تھیں جو عقل اور سمجھ میں اس سے بڑھ کر تھیں" ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بابر کے اوائل زمانہ میں ہوئیں یہ عورتیں اس کی مشیر اور رہنما تھیں۔ اس کے ترک میں فرغانہ کی حفاظت یا سمرقند کی تسخیر کرنے میں سیکڑوں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں، محاصرے۔ سازشیں۔ یورشیں، ہنگامے فتح اور شکست مذکور ہیں۔ کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے قریب دو برس اور واسکو ڈی گاما کے ہندوستان کے آنے سے چار برس قبل بابر تخت نشین ہوا۔ فرڈی نند اور ازابلد اسپین میں، ہنری ہفتم اور ہنری ہشتم اور انگلستان میں اس کے معاصرین تھے۔

بابر نے اپنی سرگزشت ترکی زبان میں اپنے ہاتھ سے لکھی ہے جو ہم تک بلا کسی تحریف کے پہنچی ہے، اس اس کی زندگی کی پوری تاریخ اس کی وفات سے ایک سال قبل تک کی صرح ہے یہ ساری تاریخ نہایت راست بازی، سادگی دلچسپی اور مردانگی کے ساتھ لکھی گئی ہے، وہ لکھتا ہے کہ جو کچھ میں لکھا ہے اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی کے اوپر اس کا پر تو پڑے بلکہ میں نے یہ سب حالات صحیح اور صاف طور پر تحریر کر دیے ہیں اور میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے بالکل یہ مراد نہیں ہے کہ میں اپنی تعریف کروں، میں نے ہر ایک لفظ کو بہت جا بجا اور صحت کے بعد لکھا ہے، اس لئے ناظرین مجھے معاف رکھیں۔

۱۔ ماں کی طرف سے سلسلہ یوں ہے: قلعہ نگار خانم بنت یونس خاں بن دایس خاں بن شیر علی دوغلن خاں بن محمد خاں بن خضر خواجہ خاں بن تعلق تیمور خاں بن عسان بخاں (ایسبنوفا) بن دایا دادا خاں بن براق خاں بن کارا خون (میسوں تو) بن متوکان (موتوکان) بن جٹائی خاں، بن خلجی خاں بن یسوی بن برطان بن کابل بن طمان بن بایسنقر بن قیدو بن دو توین بن یقین بن برزخ خاں بن آلفنوا قرقلوں (عصمت بابا پاکداسن) انقوا کے متعلق ہم نے پہلے نوٹ دیا ہے۔ دیکھو حالات تیمور۔

۲۔ ولادت ۱۴۲۵ء وفات ۱۴۵۷ء وطن جنیوا۔ فرڈی نند اور ازابلد بادشاہ اور ملکہ اسپین کی سرپرستی میں ۱۴۹۲ء میں تین چھوٹے حجاز لیکر مغرب کی طرف جزائر کنارے سے نامعلوم راستے پر حجاز ڈال دیے۔ جب خشکی نظر آئی تو اس نے خیال کیا کہ یہ مقام ہندوستان سے قریب ہوگا اسی لئے اس کا نام انڈینئر رکھا جو اب تک مشہور ہے۔ صرف اس اندیشہ سے کہ ان جزائر کے باشندوں سے جو ہندوستان کے قریب واقع ہیں علیحدہ معلوم ہوں، وہاں کے باشندے ویسٹ انڈینز (مغرب کے ہندوستانی) کہلائے جاتے ہیں۔

۳۔ پرتگال کا مشہور بحری سیاح ولادت ۱۴۷۷ء وفات ۱۵۱۹ء میں اس نے سفر شروع کیا اور ۱۴۹۸ء میں کالیٹ پہنچا۔ اس کے بعد کئی بار بادشاہ پرتگال نے سواحل افریقہ و ہندوستان پر نوآبادی قائم کرنیکی غرض سے روانہ کیا۔

۴۔ فرڈی نند ڈی کیتولک، ولادت ۱۴۷۷ء وفات ۱۵۱۹ء میں اس نے سفر شروع کیا اور ۱۴۹۸ء میں کالیٹ پہنچا اس کے بعد کئی بار بادشاہ پرتگال نے سواحل افریقہ و ہندوستان سے جنگ کی اور ۱۵۱۹ء میں اس صوبہ کو فتح کر لیا۔

۵۔ ولادت ۱۴۷۷ء زمانہ حکومت ۱۴۸۵ء سے ۱۵۱۹ء تک ٹوڈر لائن کا بانی خاندانی لحاظ سے تخت سلطنت کا مستحق نہ تھا لیکن پارلیمنٹ نے اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیا۔ جوا الزابتہ بنت اڈورڈ چارم کے ساتھ شادی ہونے سے اور مضبوط ہو گیا تھا۔

۶۔ ولادت ۱۴۷۷ء زمانہ حکومت ۱۴۸۵ء سے ۱۵۱۹ء تک۔ ہنری ہفتم کا دوسرا بیٹا تھا، شروع زمانہ حکومت میں پوپ لیو دہم نے محافظ دین کا خطاب عطا کیا اس لئے کہ اس نے لوہر کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی۔

بابر کے باپ کو سمرقند کے فتح کرنیکا بڑا حوصلہ تھا جو سلطنت تیمور کا قدیم دار الحکومت تھا اور بابر نے اس کی یہ خواہش پوری کی۔ تیمور کی حیات میں بابر تخت کی حکومت اس کے ایک بیٹے اور ایک پوتے کو تفویض ہوئی تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے شاہ رخ میرزا دلی خراسان نے اس شہر قبضہ حاصل کیا اور اپنے بیٹے النغ بیگ میرزا مشہور بہت دان کے حوالہ کر دیا تھا۔ بابر کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے اس کے بیٹے عبداللطیف میرزانے سمرقند کو نکال لیا جس نے اس بے ثبات دنیا کی محبت میں اپنے سن رسیدہ باپ کو جو علم و فضل میں ایسا فخر تھا قتل کر ڈالا۔

النغ بیگ بحر علوم و خرد کہ دنیا و دین را از بود و نیست
ز عباس شہد شہادت چشیدندش حرف تاریخ عباس گشت

تاہم دہیم شاہی پانچ یا چھ مہینہ سے زیادہ اس کے سر پر قائم نہ رہا۔

پدرکش بادشاہی را شاید اگر شاید بجز شش نہ نیاید (یہ خاص بابر کا شعر ہے)

عبداللطیف میرزا کے بعد عبداللہ میرزا تخت نشین ہوا اور ٹھنڈا دو برس سلطنت کی جس کے بعد سلطان ابوسعید مرزانے سلطنت پر قبضہ کیا اور اس نے اپنے بڑے بیٹے سلطان احمد مرزا کے سپرد کر دیا اس کے انتقال پر (۱۵۹۷ء) سلطان محمد میرزا تخت نشین ہوا اور اس کے بعد بایسنقر میرزا حاکم ہوا۔

مرزا احمد تاریخ رشیدی میں لکھتے ہیں النغ بیگ کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے البتہ اس نے ۱۵۸۷ء یا ۱۵۸۸ء میں کوئی ۳۰ برس اپنے باپ شاہ رخ میرزا کے وفات سے قبل سمرقند میں حکومت کا آغاز کیا تھا، شاہ رخ میرزا امیر تیمور کا چوتھا بیٹا تھا۔ شاہ رخ کی وفات پر جونہی ۱۵۸۷ء (۱۵۸۶-۸۷ء) میں ہوئی النغ بیگ تخت نشین ہوا جس نے ڈھائی سال تک اور سلطنت کی۔ ان جھگڑوں اور فسادات میں جو شاہ رخ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے النغ بیگ کو اس کے بیٹے عبداللطیف (رمضان ۱۵۸۷ء یا ۱۵۸۸ء) نے گرفتار کر کے قتل کیا اور اس نے اس کی تاریخ وفات کی نسبت میرزا احمد کا اندازہ صحیح معلوم ہوتا ہے النغ بیگ علم ہیات کے نقوش کا بوجہ ہے ان کو ترتیب بھی دیا ہے۔ گریوز صاحب نے انگلستان میں ۱۵۸۷ء میں پہلی مرتبہ ان نقوش کو شائع کیا جو جغرافیہ کے متعلق تھے اور آکسفورڈ کے ہائید صاحب نے ثوابت کے متعلق نقشے ۱۵۸۷ء میں شائع کئے اسی طرح فرانس میں لالاندی نے علم ہیات کے متعلق نقشے ۱۵۹۲ء میں شائع کئے۔ النغ بیگ بادشاہ اوریت داں دونوں تھا۔ اس کے آلات رصد بہتر اور بہت سے۔ رصد خانہ کا بلع دائرہ اس قدر بلند تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی جامع مسجد اباصوفیا کے برابر تھا۔ اس کی بریاد شدہ عمارت بابر کے زمانہ تک موجود تھی بابر کے الفاظ سمرقند کی عمارات کے سلسلہ میں یہ ہیں ”در سمرقند یک عمارت دیگر در دامنہ پشتہ کوہک رصد است کہ آئینہ یخ نوشتن است۔ سراپانہ است۔ النغ بیگ میرزا بایں رصد پنج گورگانی را نوشتہ کہ در عالم حال ایں پنج محمول است و بہ زنج و گیر علی کنند“ اس رصد کے بعض تحقیقات یہ ہیں (۱) قمری مہینہ کی مقدار زمانہ ۲۹ درجہ ۳۱ دقیقہ ۵۰ ثانیہ ۴۴ ثالثہ ۴۰ رابعہ ۳۰ خالصہ ہے۔ (۲) عطارد کی غایت تبدیل ۲۳ درجہ ۲۶ دقیقہ ۳ ثانیہ ہے (۳) میل کلی جو بارہ بالا قطب الاربعہ کی ایک قوس کا نام ہے ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ ۷ ثانیہ ہے (۴) منجان فارس دنیا کی ابتدائی آبادی جزائر خالدا سے اور منجان ہندکنگ ڈر سے شروع کرتے تھے۔ النغ بیگ نے زمین کر دی ہوئی دجہ سے ابتدائی آبادی ہر جگہ فرض کیا ماسکنا قرار دیا۔ شہر سمرقند کی قریب مٹراسکاٹ لیر کو ایک پہاڑ چوپان اٹا دکھایا گیا تھا جس کی بابتہ خیال تھا کہ النغ بیگ کا رصد خانہ تھا۔ اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

یہ مشہور قصہ ہے کہ النغ بیگ نے جب ستاروں کی چال سے یہ معلوم کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہو گا تو اس نے بیٹے کے ساتھ نہایت درجہ کی بدسلوکی شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے وہ باغی ہو گیا، لیکن بابر کی رائے اس واقعہ کے متعلق صاف طور پر مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بابر ضرور واقف تھا (دیکھو) صاحب کی تاریخ بخارا باب دو از دہم ہی دیکھو) مولف

میں نے بایستغریز اسے فتح کیا جو واقعات کہ بعد کو پیش آئے وہ مناسب موقع پر اس سرگزشت میں بیان کئے جائیں گے۔
بابر کی تخت نشینی سے ہم کو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر کی زندگی کا بڑا زمانہ نہایت بے اطمینانی سے گزرا ہے۔ ایک اور دوسری عجیب مثال اس امر کی پیش کی جاسکتی ہے۔ اس کی پانچ بہنیں تھیں جن میں سے دو بہنوں کو دشمنوں نے لڑائی میں قید کر کے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ یہ بادشاہوں کی بیٹیاں اور بہنیں تھیں۔

بابر نے اپنی سرگزشت میں ترکی سرداروں کے نام اور فضائل تحریر کئے ہیں جنہوں نے ہمیشہ بابر کی حمایت کی ہے۔ اس کے اس صاف گوئی سے ہم کو خود بابر اور نیز ان اراکین کے اخلاق و عادات سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک خوش مزاج، سیدھا سادھا وضع کا آدمی تھا جو مینوشی کے جلسوں میں گانے میں سب پر فوق لیجاتا تھا۔ دوسرا "ایک مقدس دیندار اور سچا مسلمان تھا جو غیر معمولی طور پر صائب الرائے اور ذی فہم تھا۔ وہ بہت ہی خوش طبع تھا اور باوجودیکہ ان پڑھ تھا پر سہی بہ لحاظ صفت ظرافت نہایت طبع تھا۔" ایک اور میر علی دوست میری نانی کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ میں ان کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ ایک کار آمد شخص ثابت ہوں گے، لیکن سال بھر سے جب تک وہ میرے ساتھ رہے ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ کونسی خدمت انہوں نے انجام دی۔" چوتھا امیر عمر بیگ تھا، یہ شخص شجاع، سیدھا اور ایماندار تھا، اس کا ایک بیٹا اب تک میرے ساتھ ہے یہ لڑکا ست کاہل اور بالکل نکما آدمی ہے۔ خدا کی شان ایسوں کے ایسے ہوں؟
اس طرح بابر اپنے اطرا اور ساتھیوں کے نام شمار کرتا اور ان کے اوصاف کا موازنہ کرتا ہے جیسا کہ شہنشاہ مرقس نے اپنے رفقاء کے چال چلن کا حال بیان کیا ہے ذیل میں چند دیگر مثیلات بیان کی جاتی ہیں جو غالباً کافی ہونگی۔

علی شیر بیگ درحقیقت ایک بمثل آدمی تھا۔ جب سے کہ ہماری زبان میں نظم پہلے لکھی گئی ہے، کسی شخص نے اتنا اور ایسا اچھا نہیں لکھا اس نے عمدہ عمدہ نغمے اپنی تصنیف میں چھوڑے ہیں جو دہن اور تان دونوں کے لحاظ سے بے نظیر ہیں ہماری تاریخ میں کسی ایسے آدمی کا نام نہیں ملتا جو ہر مندوں اور ذی علم لوگوں کا اس سے زیادہ مربی اور سرپرست رہا ہو۔

مطرب مصور اور شعرا سب ہی قسم کے لوگوں کی سرپرستی کرتا تھا، اس میں یہ ایک خصوصیت تھی کہ اس کے بی بی بیچے کوئی نہ تھے "اس نے اس عالم میں نہایت بے فکر اور آزادی سے بسر کی۔" وہ ملکی معاملات سے علیحدہ رہتا تھا اور اپنا وقت تحصیل علم اور تصنیف میں صرف کرتا تھا یہ اس کا مقولہ ہے "اے لوگو! تم کہتے ہو کہ نیر پر لعنت مت بھیجو کہ مبادا خدا اس پر رحم فرمائے، لیکن میں کہتا ہوں کہ خدا اس کی بدسلوکیوں اور مظالم کو جو اس نے آل رسول پر کئے ہیں سب کے سب معاف کر دے تو وہ انہیں بھی معاف کر دیگا جنہوں نے اس پر لعنت بھیجی ہوگی۔"

۱۵ ابو الفضل لکھتا ہے، خانزادہ بیکم ہمیشہ عینی حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی فیج سال از ایشاں کلاں بودند در ان ہنگام کہ شاہ اسماعیل صفوی اذربک را در مرو زیر کرداں پردہ نشین محضہ عفت در مرو بودند شاہ اسماعیل حرام نمود و باغ از بسیار در قندز پیش حضرت گیتی ستان فردوس مکانی فرستاد (اکبر نامہ)
۱۶ ولادت سال ۶۲۱ دفات ۶۲۱ انٹونی نس پوس شہنشاہ روم نے بتنی کیا تھا ۶۲۱ء میں اس کا جانشین ہوا، بہت بڑا حکیم اور اسٹوکیک اسکول کا زبردست فلاسفر تھا، اس کی تصنیفات میڈیٹیشن (تخلات) کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے اور اب بھی کثرت کے ساتھ مطالعہ کی جاتی ہیں باوجود اس امر کے کہ اس نے عیسائیوں کے حق میں سخت معائب نازل کر دیے اس کا شمار دمتہ الکبریٰ کے بہترین شہنشاہوں میں ہوتا ہے۔

”دوسرے شیخ بیگ تھا۔ اُس نے ایک قسم کے اشعار ایسے کہ ہیں جن میں الفاظ اور مطلب دونوں خون دلانے والے ہیں اور ایک دوسرے سے مطابق ہیں ذیل کا شعر اسی کا ہے۔“

”شب غم کر دبا آہم ز جابر دگر دوں را فرو برد اثر دہائے سیل اشکم بچ سکوں“

جب اُس نے ان اشعار کو دوبارہ پڑھا تو ملانے اُس سے کہا ”تم نظم پڑھ رہے ہو یا لوگوں کو خوف زدہ کر رہے ہو؟“

فرغانہ میں شرع کا جو سب سے بڑا عالم تھا اُسے دشمنوں نے قتل کر ڈالا۔ اس کی نسبت بابر جو خود بھی بڑا شجاع اور جواہر تھا کہتا ہے ”بلا شک میر نزدیک وہ دلی کا بل تھا۔ اس کی ولایت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ توڑے ہی دنوں بعد اُس کے سارے دشمن ہلاک ہو گئے؟ وہ ایک بڑا بیباک شخص تھا جو اُس کے تقدس کا کوئی کم ثبوت نہیں ہے۔ ہر آدمی خواہ وہ کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ تردد یا خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ دونوں باتوں سے بالکل مُبرا تھا۔“

۱۷ میں یہاں عبدالرزاق کی ایک مختصر نظم جو ایشیائی مبالغہ کی ایک دوسری مثال ہے بغیر انتخاب کے نہیں رد سکتا۔ وہ اسی ۱۷۷۷ء میں خلیج فارس کے کنارہ پر موجود تھا۔ وہاں کی شدت گرمی کا حال یوں بیان کرتا ہے۔

(ترجمہ) جیوں ہی کہ آفتاب افق سے طلوع ہوا پتھر کا جگر اُس کی شعاعوں سے کھولنے لگا،

انہیں شعاعوں نے افق کو ایسا جھلسایا۔ کہ پتھر کا جگر جگر موم ہو گیا،

پانی کی تہ میں مچھلیوں کے جسم مثل اے ریشم کے جلنے لگے جو آگ دکھلائے جاتے ہوں،

پانی اور ہوا دونوں کی حدت اس حد تک تھی کہ مچھلیاں آگ میں پناہ لینے کو چلی آئیں،

میدانوں میں شکار کہنیلنا نہایت آسان ہو گیا تھا، کیونکہ صید گاہ یا جھل بھنے ہوئے غزالوں سے اُٹا ہوا تھا، (مولف)

۱۸ بابر کی صحبت میں جن اجلہ روزگار اور ارباب کمال کو تقرب حاصل تھا۔ ان میں ایک امیر البقاع تھے جو علم و حکمت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ دوسرے شیخ زین صدر

نیرہ شیخ زین الدین خوانی بڑے تیز طبع تھے فنِ انشاء شاعری میں کمال حاصل تھا۔ ہمیشہ بابر کی صحبت میں رہائے، ہمایوں کے عہد میں امارت کے درجہ

تک پہنچے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے ”شیخ زین صدر وقتیکہ بلاءِ زمّت رسید پر سپید نہ کہ عمرت چند است؟ شیخ گفت پیش ازین ہفت سال چل سالہ

بودم و قبل ازین بدو سال چل سال داشتم و اکنون نیز چل دارم، بادشاہ بے تامل مقصود شیخ دریافت و تحقیق فرمود“

زین خاں نے ترک بابر کی ترجمہ کیا تھا ان کے علاوہ یہ اصحاب تھے۔

شیخ ابوالوجہ فارسی خال شیخ زین خوش صحبت و خوش طبع تھے، شعر بھی موزوں کر لیتے تھے۔ سلطان محمد کو سہ اُن کے دائرہ میں بال نہ تھے اس لئے

کو سہ کھلائے جاتے تھے۔ طبع لطیف پائی تھی، بڑے سخن شناس تھے مولانا شہاب معانی حقیری تخلص کرتے تھے بڑے ذی علم و فضل تھے شاعری

میں مستگاہ حاصل تھی۔

مولانا یوسفی طبیب خراسانی بڑی صفت کے بزرگ تھے سرخ و داعی فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے۔

ملا باقی کو شاعری میں اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ مخزن الاسرار نظامی کی بحر میں بابر کے نام منسوب کی تھی۔

خواجہ نظام الدین علی خلیفہ، فراست و تدبیر کی وجہ سے خاص مرتبہ حاصل تھا، فنِ طب میں خاص بہرہ رکھتے تھے

میر دردیش محمد ساربان ناظر الدین خواجہ اصرار کے مرید خاص تھے، خوش صحبتی و فضیلت میں ممتاز تھے، بادشاہ اُن کا بڑا اعتبار کرتے تھے۔

خواند میر، فاضل مورخ بڑا خوش صحبت تھا؛ تاریخ حبیب السیر خلاصۃ الاخبار و دستورالوزرا خاص تصانیف میں۔

خواجہ کلاں بیگ، امرائی بزرگ دہلی صحبت میں سے تھا۔ سنجیدگی اطوار و شائستگی فضا میں ممتاز تھا اس کا بیانی معتمد خاص و مہر دار تھا۔

بابر جو خسر و شاہ سے سخت نفرت رکھتا تھا اس کی نسبت لکھتا ہے "اس بی وفا اور ناپائیدار دنیا کی طمع سے جو نہ کبھی کسی کی ہوئی اور نہ ہوگی اس احسان فراموش اور ناشکر گزار نے سلطان کو جس نے بچپن سے سن بلوغ تک خود پرورش کی اور اسے لکھایا پڑھایا تھا اگر فخر کر کے نشتر سے اندھا کر دیا بیعت کے دن تک ہر روز ہزاروں اور لاکھوں لعنت اس کی گردن پر ہو جو ایسی مذموم دعا بازی کا مرتکب ہوا ہے جو شخص خسر و شاہ کے اس فعل کو سنے اس پر لازم ہے کہ لعنت نیہیجے، کیونکہ جو شخص اس قسم کے افعال قبیحہ کو سنے اور لعنت نہ نیہیجے خود اس قابل ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے" علی شہر کے اشعار نے اس قسم کے فقرہ کا مضمون سو جھایا ہو گا۔

اس قسم کے سردار تھے جو بابر کے دربار میں جمع تھے۔ جن کے ذریعہ سے اور جن کے خلاف اس کو کام کرنا پڑتا تھا۔ ان کے ساتھی ہمارے مگر غیر مستقل فرائض تھے ان کے شہر والوں نے بابر کی ادارہ گرد فوج کا جس میں بعض اوقات دو سو سپاہیوں سے بھی زائد نہ رہتے تھے، کبھی تو خیر مقدم کیا، کبھی ان کو مردود کر دیا۔

بابر نے فن جنگ بے قاعدہ طور پر سکھایا تھا لیکن جو کچھ بھی سکھایا تھا نہایت مکمل طور پر۔ ایک موقع پر اس کے سپاہیوں نے زبردستی بہت سا مال لوٹ لیا جسے بابر نے واپس دلایا لکھتا ہے میری فوج قاعدہ کی ایسی پابندی کہ کل مال غنیمت بلا استثناء واپس کر دیا گیا۔ اور دوسرے دن پہلی بار جائزہ لینے سے قبل ایک تاکے کا ٹکڑا یا ٹوٹی ہوئی سوئی تک باقی نہ رکھی ہے۔ جو مالکان کو واپس نہ دیدی گئی ہو۔ بابر ان پہلے حکمرانوں میں سے ہے جنہوں نے بجائے مختلف جگہوں اور گردہوں کے دیوانہ وار حملہ کرنے کے فوج کی تقسیم کر کے رسالوں کی یکجا پورش کر نیکا قاعدہ جاری کیا۔ سمرقند جسے بابر بہت عزیز رکھتا تھا تین بار قبضہ میں آیا اور نکل گیا۔ لیکن وہ وہاں کی عمارات کی بار بار تعریف کرنے سے کبھی نہیں ٹھکرا۔ لکھتا ہے "تمام آباد حصہ دنیا میں چند ہی شہر اس خوبصورتی کے ساتھ واقع ہوں گے" بابر کے حکم سے اس کی شہر نپاہ کی پیمائش کی گئی جس کا دو پانچ میل بحساب انگریزی نکلا "بابر اس کا عرض البلد ۳۹ درجہ ۳۷ دقیقہ اور طول البلد ۹۹ درجہ ۱۶ دقیقہ بیان کرتا ہے" یہ حساب آٹھ بیگ کے نقشہ جات کے مطابق ہے جس نے طول البلد کا شمار مقام فیروز سے کیا ہے، آٹھ بیگ (۱۳۹۳-۱۴۲۹) کا نام بمقابلہ بادشاہوں کے سامنے داں ہونے کی حیثیت سے مشہور ہونے کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ اس کا تین برس کا مختصر زمانہ حکومت سواترنا کامیوں اور مصائب میں گزرا لیکن اس کی شہرت بحیثیت مہندس اور ہیت داں ہونے کے لازوال ہے۔

اسکندریہ کے یونانی مدرسوں کے بعد سے سلسلہ دار بغداد، قرطبہ، سیوا مل، طنجہ اور سمرقند دارالعلوم رہے اور سلسلہ یعنی ٹیکو کے زمانہ

۱۷ یہ جزیرہ افریقہ کے شمالی و مغربی سمت جزائر کنارے میں واقع ہے۔

۱۸ جنوبی اسپین کا ایک شہر دریائی گواڈالکوار کے کنارے واقع ہے یہاں نہایت خوبصورت چوک اور ایک عالی شان گرجا بنا ہے، جو پہلے موزوں کی مسجد تھی۔ موزوں

۱۹ کے عہد میں قرطبہ صدر مقام تھا۔

۲۰ مراقش کا خاص بندر گاہ۔

۲۱ یہ بات دلچسپی کے ساتھ سنی جائیگی کہ ترکستان کے جدید فرمانروایان (روسوں) نے سمرقند میں رصد گاہ قائم ہونے سے ۴۲۰ سال بعد ایک دوسری رصد گاہ چلی

۲۲ ٹیکو برآہی۔ ولادت ۱۵۳۶ء وفات ۱۶۱۶ء بالینڈ کا سربراہ اور وہ ممتاز ہیت داں ۲۰ برس تک جزیرہ ہون کے رصد خانہ تعمیر کر کے، بادشاہ فریڈرک میں نہایت

خود و خوص کے ساتھ تار و کی چال کا مشاہدہ کرتا رہا ۱۵۸۷ء میں اور برگ (ڈنمارک) میں رصد خانہ قائم کیا۔ اس کے بعد پھر برابر رصد خانہ قائم ہوتے رہے۔

۱۷ تا ۱۹۱۶ء تک قائم رہا

مغربی اقوام میں علم و فن نے جنم لیا۔ آٹھ بیگ فلسفہ عربی کا آخری استاد تھا۔ ٹیکو سے ایک سو پچاس برس قبل آٹھ بیگ نے رصد کے متعلق بڑے بڑے آلات تیار کئے اور قریب ایک سو سچوں اور ہندسوں کی مدد سے اس نے اپنے مشہور نقشے جات تیار کئے جن میں سیاروں کی حرکت اور ستاروں کی فہرست درج ہے۔

بابر کا بیان ہے کہ آٹھ بیگ کی رصد گاہ کوہ کالک کے دامن میں سہ منزلہ بنائی گئی تھی۔ دنیا بھر میں سات یا آٹھ رصد گاہوں سے زیادہ نہیں بنائی گئیں۔ اس میں سے ایک خلیفہ مامون الرشید دوسری عظیم الشان نے بمقام اسکندریہ بنایا تھا، کالج حمام اور مساجد ہر تعریف و توصیف کے لائق تھیں یہاں تک کہ ”نا بنا یوں کی دوکانیں بھی نہایت عمدہ تھیں اور طباطبائی نہایت ہوشیار تھے“ سمرقند کی سڑکیں پختہ کر دی گئی تھیں اور نلوں کے ذریعہ سے پانی تمام شہر میں پہنچایا جاتا تھا۔ اس جگہ بابر نے سمرقند کے نفیس خریدہ اور اس کے ماتحت شہر بخارا کی شراب کی تعریف کی ہے سمرقند میں جبکہ شراب کا دور چلتا اور میں شراب پیتا تو صرف بخارا کی شراب استعمال کرتا تھا، ”یہاں کے لوگ صاحب علم و فضل تھے اور شاعروں کی نہایت مہماں نوازی کرتے تھے، یہیں بابر نے فن شاعری کو حاصل کیا اور اس میں کچھ کمالات نہیں پیدا کیا۔ اس شہر میں بہت سی عالی شان عمارتیں مساجد، دارالعلوم اور محلات تھیں جنکی تعمیر میں تیمور نے خود صنایعوں کی رہنمائی کی تھی یہ عمارت پچھلے کاری، مینا کاری اور تصویر کشی کے آراستہ تھیں۔ دارالعلوم علما اور طلباء سے بھرے ہوئے تھے اور شاہی دربار میں شعرا اور مصوروں کا مجمع رہتا تھا۔ یہ زمانہ ترکی تعلیم کی بہار کا تھا جس میں جہالت کی درمیان سے شگونے نکل رہے تھے، مگر خواص میں سے بھی ہر نفس خواہ نہ تھا اور اس لئے حافظہ اعلیٰ درجہ کی قوت پارہا تھا، جیسا کہ ان میں سے ایک نے کہا تھا ”جب ایک شخص نے ایک مرتبہ کوئی بات سنی تو وہ اسے کیونکر بھول سکتا ہے؟“ ہلالی شاعر کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ تیس یا چالیس ہزار ابیات اسے زبانی یاد تھے، اگرچہ قوت حافظہ کے یہ اوصاف ہم زمانہ حال کے لوگوں کے نزدیک غیر معقول خیال کئے جاتے ہیں جو روایت پر بہ نسبت سماعت کے زیادہ مدار رکھتے ہیں، تاہم بلاشبہ یہ امور صحیح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ رگ وید میں دس ہزار سے کچھ زیادہ ہی اشلوک ہیں اور دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک اس کا تحفظ محض زبانی یادداشت پر مبنی تھا اور ایک نہیں بلکہ ہزار ہا برہمن لفظ بہ لفظ اسے زبانی پڑھ سکتا تھا۔ (باقی)

سید عبد السبحان ناظر

۱۔ سید قدیم رصد خانہ قتلون نے سن ۳۳۷ھ میں سیاح قائم کیا اور اول اول مراغیہ کا قیاس ہی میں کیا گیا اور آلہ ہیلو میٹر (قائم) کا استعمال ہوا۔ پرتیور فارس، نالادوس، ابرخس نے رصد خانے قائم کئے مسلمانوں سے پہلے کا نہایت مشہور رصد خانہ وہ تھا جس کا مہتمم عظیم الشان تھا جس نے ایک منظم رصد خانہ کی بنیاد ڈالی۔ ضروری آلات ایجاد کئے اور بر خلاف فیثاغورث زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیا۔ ۲۔ دوسری صدی کے اوائل میں پیدا ہوا اور ۷۰۰ء میں کی عمر پر اس نے انتقال کیا۔ اصل میں یونانی تھا اور اسکندریہ چلا آیا تھا حکیم جالینوس کا شاگرد اور نہایت مشہور جغرافیہ و ہیئت داں جس کے نقوشوں پر ہندو ہجری صدی تک عملدرآمد ہوتا رہا، جبکہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا اس نے زمین کو ساکن اور مرکز کائنات مانا تھا جس کے رد و اثبات دیار سے چکر لگاتے ہیں سن ۱۵۷۷ء میں کولمبس نے جب اپنے مسائل پیش کئے تو یہ اصول غلط ثابت ہوئے اس نے متقدمین علماء ہیئت خصوصاً پتالیمس (ابرخس) کے سیاروں اور ثابت کی فہم ثبوت کی تصحیح کی اور ایسی جدید بنائیں جن سے سورج و چاند وغیرہ کی گردش کا حساب لگ سکتا ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اصطلاح وغیرہ آلات رصد ایجاد کئے۔ کتاب تجسلی اس کی بیش بہا تصنیف ہے نامور مسلمان علماء ہیئت فضل بن یحییٰ تبریزی و محمد بن جابر و ابوریحان خوافی اس کی فضیلت کے معترف ہیں۔ یحییٰ بن خالد برقی وزیر خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے حکم سے اس نے اس کتاب کے تیرہ مقالوں کا ترجمہ یونانی سے عربی زبان میں کیا گیا۔ فن جغرافیہ میں اس کی کتاب عربی ترجمہ کندی نے کیا تھا۔ علم موسیقی میں بھی ایک کتاب تین جلدوں کے خواںدیلانوں کے نزدیک یہ نسخہ الاعتقاد ہی نہ تھی، پیغمبر اسلام فرماتے ہیں ”جس گھر میں کتاب یا تصویر ہو انہیں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور دوسرے موقع پر اس خواجہ کمال تبارک کے ساتھ بیان فرمایا ہے ہر مصور ناری ہے“ یونانیوں کی طرح مسلمان بھی مصوری اور ثبت تراشی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن وہ صناعتی کے بہت جلد و لدادہ ہو گئے۔ بابر کے بعد سے سمرقند میں علم و ہنر کو تیزی کے ساتھ منزل ہو گیا۔ اور سترہویں صدی تک یہ منزل برابر ہوتا رہا جس کا دور یہ وہ ایک حالت پر قائم ہو گیا سن ۱۷۷۷ء میں اس شہر پر قبضہ حاصل کیا اور ممکن ہے کہ اب بیویں صدی میں ترکستانی کا لکھنؤ اوقاف ہو (مؤلف)

ہمشیر مرحومہ کی یاد میں

ایک حیرت ہے بزم امکان میں کس قدر طاقتیں ہیں انسان میں
 دوڑتا ہے فضلے گردوں میں کو د جاتا ہے نیل و حبیبوں میں
 ذرہ عرش تک رسائی ہے ہر تارے سے آشنائی ہے
 آسمانوں کو دیکھ بھال لیا خونِ رگ ہر سے نکال لیا
 بہر لے آستیں میں شمس و مہر چھین لی دور آسماں سے سحر
 سینہ بھر پر یہ رنگِ خرام ہند میں ہے سحر تو مصر میں شام
 حیدر آباد میں مکان ہے مرا اور پشاور میں ہنر باں ہے مرا
 اپنے اپنے مکاں میں بٹھکے ہم رذر کرتے ہیں گفت گو با ہم
 بحر میں جو گہر فروزاں تھے دور گہرائیوں میں پنہاں تھے
 ہوشوں کے گلے کے ہار میں قبضہ تیغ آب دار میں ہیں
 قعر دریا سے ان کو لے آیا یہ ہے انسانِ خاک سرمایہ
 دفن تھا خاک میں جو گنج گراں کر دیا اس کو آدمی نے عیاں
 قوتیں جو ملک نہیں رکھتے مہر و ماہ و فلک نہیں رکھتے
 دیو میں ہیں نہ شیر غراں میں جمع ہیں اب و خاکِ لہاں میں
 قدسیوں کو بھی جن کا علم نہیں جن سے نا آشنا ہیں عشائیں

راز وہ کھل چکے ہیں سرتاسر

اس خفیہ الوجہ انسان پر

موت کا راز ہے وہ راز کہ ہم جس سے رکے گئے ہیں نامحرم
 مل گئے خاک میں جاں کے جاں مٹ گئے کیسے نازنیاں
 بادشاہوں کی سلطنت نہ رہی کج کلاہوں کی تکنت نہ رہی

مصر و بابل کی داستان بھی نہیں مہیکل روم کا نشان بھی نہیں
 زار و جسم سو رہے ہیں یہ زمین گم ہیں ہندوستان کے تخت نشین
 دہرا ن سحر جمال بھی خاک عاشقان شکستہ حال بھی خاک
 ہو گئے علم اس مقام پر ختم روز روشن ہو جیسے شام پر ختم
 ہو گیا دور دل سے صبر و قرار عقل کرتی ہے عجز کا اقرار

پردہ اس راز سے مٹا ہی نہیں

اس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

اصغر حسین خاں نظیر

شہید حنیف

مجھے عیش سے ہے نفرت کہ حریف ارتقا ہو
 مجھے ریخ میں ہے راحت کہ یہی رہ بقاء ہو
 نہ شغف ہے معصیت سے نہ غرور افتا ہے

نہ حریص زندگی ہوں، نہ حریف زندگی ہوں
 ہے مجھے یقین کامل کہ ردیف زندگی ہوں

نہ چین سے واسطہ ہے نہ اسیر رنگ بو ہوں
 نہ میں بندہ غرض ہوں نہ غلام آرزو ہوں
 ہے مجھے تلاش اپنی میں شہید حنیف ہوں

مری کادشوں کی غایت نہ زمین ہے نہ ذرا
 مری زندگی کا مقصد تو کسیں بلند تر ہے

امین حزیں

رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر بین تاریخ تک نہ دی جائیگی تو رسالہ مفت روانہ نہیں کیا جائیگا۔ منیر

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر مقبول عام ہو گیا ہے

اہل دہلی اور اہل لکھنؤ

یہ کلیہ ہر شے کا ایک مرکز ہوا کرتا ہے۔ اسی کلیے کی بنیاد پر پہلے اہل دہلی نے ”اردو کے ہم اہل زبان ہیں“ دعویٰ کیا۔ لیکن اس دعویٰ کی زرا صراحت ضرور ہے مثلاً وہ کیا زمانہ تھا؟ وہ کون لوگ تھے؟ اور اسباب کیا تھے؟

مذکورہ آب حیات میں آزادانہ مضمون، یک رنگ وغیرہ کو جو دلی اور رنگ آبادی کا معاصر بنا کر دور اول میں جگہ دی ہے یہ حضرات صاحب دیوان نہ تھے اور اگر بعض تھے بھی تو دلی کے تابع تھے۔ کیونکہ شاہ حاتم اور مصحفی کے اقوال سے ثابت ہو گیا ہے کہ جب تک دلی کا دیوان دکن سے دہلی نہ پہنچا تھا، دہلی کی شاعری دوہوں اور کبت کے میدانوں میں گشت کر رہی تھی۔ اس کے بعد فارسی وضع سے غزل اور ردیف وار غزلوں سے دیوان مرتب ہونے لگے۔

چونکہ دلی اور رنگ آبادی کے دہلوی معاصر شعرا کے لئے وہ ایک ابتدائی زمانہ تھا، خود نو سکھ تھے اس لئے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا۔ دہلی میں شعرائے دور دوم یعنی شاہ حاتم اور خاں آزد کے شاگردوں کا جب زمانہ آیا تو یہ حضرات اب نچتہ کاری اور ہندوستان کے پایہ تخت کی خود داری کی ترنگ میں اردو کے اہل زبان ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔ ان دہلیوں کے صف اول میں میر تقی میر اور ان کے معاصر سمجھے گئے۔ چنانچہ میر جیب لکھنؤ پہنچے ہیں تو اہل لکھنؤ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ۷

کیا بود و باش پوچھو ہو پور کے ساکنو ہم کو غریب جان کے منہ نہیں کپارے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اسکو فلک نے لوٹ کے دیرن کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجرے دیار کے

حالانکہ میر خود اکبر آباد کے تھے مگر دہلوی بن گئے تھے۔ اور مصحفی کہ یہ بھی امر وہ کے تھے مگر دہلوی بن کر کہتے ہیں ۷

دہلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی میں رہنے والا ہوں اسی اجرے دیار کا

میں لکھنؤ میں زمزمہ سبجان دہر کو برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

غرض دلی سے اپنے دیوان کے سلسلہ جلوس محمد شاہی میں دہلی میں پہنچے ہیں اس وقت ۱۳۳۳ھ تھا۔ اور میر جیب لکھنؤ پہنچے ہیں اس وقت ۱۳۹۴ھ تھا۔ گویا (۶۴) برس میں دکن کا صرف ایک استاد دلی میسر ہونے کے بعد اہل دہلی اردو کے اہل زبان بن گئے۔

اور میر لکھنؤ پہنچے (۱۳۹۴ھ) کے بعد سے تاریخ وغیرہ کے عروج یعنی ۱۳۴۲ھ تک (۴۵) سال کی مدت نظر آتی ہے کہ لکھنوی

حضرات اردو کے اہل زبان بن گئے، کیونکہ بقول اب حیات، لکنؤ میں اہل زبان ہونے کی ناسخ آتش ضمیر خلیق نے بنیاد ڈالی اور انیس وزیر صبا، رند، سرور نے خاتمہ کر دیا۔

گزشتہ حصہ مضمون سے ہم واقف ہو جانے کے بعد اسی حیثیت سے حیدر آباد کو دیکھیں تو بعض چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جس سے استعجاب و تحیر کی کوئی حد نہیں رہتی، مثلاً ولی اور نگ آبادی سے موجودہ زمانے تک یہاں ایک قرن بھی ایسا نہیں گزرا جس میں شعرائے حیدر آباد نے خاموشی سے بسر کی ہو۔ کیوں کہ ہر عہد میں یہاں شعرا کا بڑا گروہ موجود نظر آتا ہے۔ گزشتہ دو سو برس میں خصوصاً چار دور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ایسے گزرے ہیں کہ ان زمانوں میں اگر شعرا کی تعداد دریافت کرنا چاہو تو مشکل ہے۔

پہلا دور ۱۔ ولی۔ سراج۔ داد۔ شنیق۔ جرات وغیرہ اور ان کے کئی صاحب دیوان معاصر اور ان کے بکثرت شاگرد اور نگ آباد و حیدر آباد میں موجود ہیں۔

دوسرا دور ۲۔ راجہ چند دلال شاداں (وزیر اعظم حضرت آصف جاہ ثالث) کا زمانہ ہے کہ دور اول کے بعض اساتذہ بھی زندہ ہیں اور ان اساتذہ کے بیسیوں تلامذہ جمع ہیں جیسے شاہ حفیظ۔ خان تننا۔ خواجہ بہت۔ شاہ بکلی وغیرہ۔ اسی عہد میں دہلی کا مشہور شاعر شاہ نصیر حیدر آباد میں ہے اور شاہ حفیظ حیدر آبادی سے معر کے رہتے ہیں۔

تیسرا دور ۳۔ حضرت میرٹس الدین فیض رحمہ کا زمانہ ہے گو آپ شاہ حفیظ و شاہ نصیر کے معرکوں میں شریک تھے مگر حیدر فرزند شاہ حفیظ کے معاصر سمجھے گئے۔ حضرت فیض بہ کے شاگردوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ اور اسی عہد میں شرر اور شوق شاگردان خان تننا بھی اساتذہ مراتب رکھتے تھے۔

چوتھا دور ۴۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ داغ و امیر حیدر آباد آچکے ہیں اور یہ حضرات جب حیدر آباد آئے ہیں اس وقت حضرت فیض احمد کے اکثر ارشد تلامذہ بقیہ حیات ہیں اس کے بعد داغ وغیرہ کے بھی سیکڑوں حیدر آبادی شاگرد ہو گئے۔ افسوس ہے کہ بعض نگاہوں میں اب بھی حیدر آباد اردو کا اہل زبان نہیں ہے۔ !!

یہ جو کچھ لکھا گیا صرف تمہید تھی اور اس مضمون سے میرا اصلی مقصد۔ مولوی خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکنؤی کے اس مضمون پر نظر ڈالنا ہے جو ”شوخی گفتار“ کی سرخی سے (رسالہ ”صلائے عام“ (دہلی) جلد ۱۳ نمبر ۱۱ بابۃ نومبر ۱۹۲۶ء میں) شائع ہوا ہے اور یہ تمہید اصل مضمون سے بہت کچھ تعلق رکھتی ہے۔

بالفرض ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ عشرت صاحب کو اردو کے ساتھ ہمدردی کا خیال ہے۔ مگر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ عشرت صاحب جو راستہ چل رہے ہیں، وہ اصولاً ترقی اردو کی راہ ہے۔ کیونکہ مضمون ”شوخی گفتار“ سے بعض سطحی اختلافات علیحدہ کر دینے کے بعد

۱۔ میر اسودا، انشا، جرات، اور مصحفی ان تمام اساتذہ میں سب کے آخری نمبر ۱۲ء میں مصحفی کا انتقال واقع ہوا۔ اور بقول خود ناسخ (از اب حیات) غرض سید انشا اور مصحفی کے معر کے بھی ہو چکے۔ جرات اور ظہور اللہ فاں نوا کے ہنگامے بھی طے ہو گئے جب زمانہ سارے ورق الٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غول پڑہنی شروع کی ۱۳۔ انشا اللہ تعالیٰ پر کہی شاہ حفیظ اور شاہ نصیر کا ہر طرح کلام ٹیکل موازنہ پیش کیا جائے گا۔ (عالی رفائی)

یہ چیزیں قابل غور ہیں۔

صفحہ ۳۶

”میں نے سنا ہے کہ والی حیدر آباد کو بھی کچھ ایسا دھوکا دیا گیا ہے کہ حیدر آباد
”کی زبان کے محاورے دہلی و لکھنؤ کی تقلید میں نہ ہوں بلکہ حیدر آباد کے
”محاط سے ہوں“

اسی مضمون میں صفحہ ۳۴ پر عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد کو آپ ترقی اردو کے اسباب میں شمار کرتے ہیں اور پھر محاورے مرتب کرنے کے بارے میں دہلی
دکھنوی کی پابندی چاہتے ہیں۔ دیکھئے !! پہلے تو آپ نے اردو کی صحیح بھی خواہی کے اصول پر چلنے کی کوشش کی تھی اس کے بعد دہلی و لکھنؤ کے
افتخاری پہلو کو نہ چھوڑنے کے خیال میں حقیقی اصول ترقی اردو سے ہٹ کر بعض شہروں کی تخصیص پر اتر آئے۔ ہاں اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ
جیت تک کوئی مرکز قرار نہ دیا جائے اس وقت تک حقیقی ترقی نہ ممکن ہے اس لئے کہ تمام ہندوستان میں علیحدہ علیحدہ اصطلاحات و محاورات
مرتب ہونے لگیں گے۔ گو ایک حد تک یہ ٹھیک ہے مگر پہلے یہ غور لازم ہے کہ دہلی یا لکھنؤ مرکز قرار پانے کے اسباب کیا تھے؟ اس کے جواب
میں ضرور کہنا پڑے گا۔ بقول صاحب آب حیات :-

”لکھنؤ کو دیکھ سچ لو کہ دلپسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد کسی شہر کے اینٹ
”پتھر کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں شالستہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہوں گے
”اور دلپزیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے“
صاحب آب حیات کی اس تحریر کو خود آپ اپنے الفاظ میں یوں ادا کرتے ہیں :-

”لکھنؤ نے جو مستند ہونے کی برکت حاصل کی اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہاں کے
”لوگوں نے زبردستی یا دہلی والوں کی مخالفت کر کے زبان چھین لی، بلکہ دہلی جن لوگوں
”سے مراد تھی ان کو اپنے یہاں جمع کیا۔ ان کی عزت کی ان کے مرتبے بڑھائے
”ان کے نازا دھکائے اور وہ سب معہ اہل و عیال لکھنؤ چلے آئے۔ دہلی خالی ہوئی
”اس وقت لکھنؤ نے اپنی سیوا کا میوا کھایا۔“

صفحہ ۳۷

اگر واقعی آپ کے مستند اہل زبان ہونے کے یہی وجوہات ہیں تو افسوس ہے کہ آپ نے حیدر آباد کو بھی اسی نظر سے نہیں دیکھا کہ حیدر آباد کے
فرمانرواؤں اور رؤسا نے بھی اردو کے حقیقی سرپرست بننے میں کیا کیا دھپیاں لی ہیں۔
اگر خود دارمی کے پردے آنکھوں پر سے ہٹا دیے جائیں تو حیدر آباد آج نہیں بلکہ برسوں سے مجمع علماء و ادباء نظر آئے گا اور یہ حیدر آباد ہی
کا ظرف ہے کہ باوجود اتنے کملائے عصر کو اپنے خوان کرم پر جمع کر لینے کے یہی فخر و مباہات کے نعروں کو اپنی زبان پر جائے دنیا تنگ ظرفی اور
تنگ چشمی سمجھتا رہا۔

۱۔ کیا آپ یہ غلط ثابت کر دیں گے کہ دہلی اور لکھنؤ کے فرمانرواؤں نے اپنے استادوں کی جو حوصلہ افزائی کی تھی فرخندہ بنیاد حیدر آباد

کے فرمانرواؤں نے اس سے بدرجہا اپنے ساتھ کی زیادہ قدر و منزلت کی (دہلی کو تو چوڑی دیکھیے کیونکہ اردو کے عروج کے ساتھ ساتھ سلطنت کا نزول ہو رہا تھا۔ بحث تو صرف لکھنؤ کے قیاض اور حاکم ثانی آصف الدولہ سے ہے) لکھنؤ میں آصف الدولہ کے استاد میر سوز کو تین سو روپیہ ماہانہ مقرر تھے۔ اور حیدر آباد میں داغ بیس سے فصیح الملک ہوئے اور ماہانہ دو ہزار روپیہ پاتے تھے اور جلیل ہیں جلیل القدر اور فصاحت جنگ ہوئے اور پانسو روپیہ ماہانہ سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ ترقی ہوئی۔

۲۔ لکھنؤ سے سودا کو پانچ سو روپیہ اور تیر کو دو سو روپیہ ماہانہ مقرر تھے (کہا جاتا ہے) یہاں حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق جو شعبہ تالیف و ترجمہ ہے اور دارالترجمہ سے موسوم ہے اس میں تقریباً پندرہ اراکین ہیں اور ہر رکن کی ماہوار پانچ سو روپیہ ہے اور ناظم دارالترجمہ کو ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتی ہے۔ کیا تیر۔ سودا۔ سوز ان اراکین سے بھی کم رتبہ تھے یا اسی قدر دانی کے مستحق تھے کہ جس قسم کی قدر دانی ان کے ساتھ کی گئی؟

۳۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں وہاں ایک جامعہ ملیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) کا قیام تھا جو پانچ کروڑ کے صرفہ سے قائم کیا گیا تھا جامعہ عثمانیہ کے پروفیسروں کو یہاں چھ سو روپیہ ماہوار مقرر ہے (یہاں اردو کی تعلیم لازمی ہے)

۴۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں مالک محروسہ کے ناظم تعلیمات کو تقریباً دو ہزار روپیہ ماہوار مقرر تھی؟ جو آج یہاں ہے۔

۵۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں وہاں شاہی اور امدادی مدارس کی تعداد چار ہزار تھی؟ جو آج یہاں ہے۔

۶۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں وہاں مدارس میں اردو زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی؟ جو آج یہاں ہے۔

۷۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں ملکی دفاتر کی زبان اردو قرار دی گئی تھی؟ جیسی کہ آج یہاں ہے۔

۸۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں ملکی تعلیم پر لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی بعض طلبہ کو امریکہ اور یورپ سے تعلیم حاصل کرنے سالانہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ خرچ کئے جاتے تھے؟ جیسا کہ آج یہاں ہے۔

صفحہ ۳ پر پانچ زبان کے بارے میں دہلی کی ادلیت ہمیشہ قائم رہے گی۔ لکھنؤ نقش ثانی
 ”ہے اب خدا کوئی آصف الدولہ جیسا قیاض حاکم ثانی پر پیدا کرے تو وہ“
 ”نقش ثالث بھی بنا سکتا ہے“

ہم اس بحث کو سر دست نہیں چھیڑنا چاہتے کہ ادلیت دہلی کو ہے یا دکن کو۔ کیونکہ اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہوگی اور یہاں صرف آصف الدولہ کی علمی سرپرستیوں اور ادبائے عصر کی حوصلہ افزائیوں سے بحث تھی جس کا تذکرہ ابھی گزر چکا ہے۔

اب حیدر آباد کی حوصلہ افزائیوں اور قدر دانیوں کے بعض مناظر دیکھیے

۱۵ اگر آپ اس بارے میں تحقیق کے جو یا ہیں تو میرا مضمون ”تحقیق اردو“ رسالہ تحفہ جلد ۲ نمبر ۲ و ۳ بابۃ صفر و ربیع الاول شریف ۱۳۲۷ء میں شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمائیے (عالی مقامی)

عطر خا جیسا صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملیگا دوسری جگہ نہیں مل سکتا

۱۔ مولوی غلام امام شہید لکنؤی شاگرد قلیل و محفی کو سرکار آصفیہ سے چار سو تیس روپیہ ماہوار بلا شرط حاضری یعنی دربار داری مقرر تھی؛
۲۔ میر احمد علی خاں شہید شاگرد شاہ نصیر کو (بہمدولی عہد) آصف جاہ رابع کے اتالیقوں میں مامور فرمایا گیا تھا، اور آصف جاہ رابع نے اپنے عہد حکومت میں انہیں امیر الشعر خطاب سرفراز فرمایا۔

۳۔ ذوالفقار علی خاں صفا شاگرد میر چند دلال شاداں کے یہاں سے پانچ سو روپیہ ماہانہ مقرر تھے۔

۴۔ رضا طلب خاں فدائی دہلوی کو آصف جاہ اول کے زمانہ میں قلعہ داری و فوجداری قلعہ رانچور سرفراز فرمائی گئی تھی۔

۵۔ مرزا علی لطف (صاحب تذکرہ گلشن ہند) آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں چار سو روپیہ ماہانہ سے سرفراز تھے۔

۶۔ مرزا قمر الدین منت شاگرد میر شمس الدین فقیر آصف جاہ ثانی نے ایک وقت دس ہزار روپیہ انعام اور دو سو روپیہ ماہوار سے سرفراز فرمایا تھا۔

۷۔ راجہ مدن سنگھ موزوں آصف جاہ اول اور ناصر خبگ شہید کے زمانوں میں دو ہزاری منصبداروں میں شریک اور خطاب راجہ سے ممتاز تھے۔

۸۔ مرزا علی رضا مہزون دہلوی شاگرد میر ممنون دہلوی چند دلال شاداں کے یہاں سے سو روپیہ ماہوار مقرر تھی۔

۹۔ حافظ تاج الدین مشتاق (بعض تذکروں میں انہیں شاگرد ناسخ لکھا ہے) چند دلال شاداں کے یہاں سے پانچ سو روپیہ ماہانہ مقرر تھے۔

۱۰۔ شاہ نصیر دہلوی شاگرد میر محمدی مائل انہیں بھی چند دلال شاداں ماہانہ سات سو پچاس روپیہ دیا کرتے تھے۔

۱۱۔ محمد عیسیٰ خاں آفاق دہلوی [شاگردان قائم چاند پوری، ان ہردو بھائیوں کو شمس الامرا امیر کبیر کے یہاں سے دو

۱۲۔ محمد موسیٰ خاں شہرت دہلوی] دو سو روپیہ ماہانہ مقرر تھے۔

۱۳۔ شاہ حفیظ حیدر آبادی کو چند دلال شاداں نے سلطنت کی طرف سے ملک الشعر کا خطاب اور ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دی تھی۔

۱۴۔ آصف جاہ ساوس نے اپنے استاد فصیح الملک کو ایک وقت انٹی ہزار روپیہ مرحمت فرمایا تھا۔

اب ناظرین غور کریں اردو کی حقیقی سرپرستی اور اساتذہ کی حوصلہ افزائی دہلی اور لکنؤ میں کی گئی یا حیدر آباد میں۔

اکھ لکھ کر حیدر آباد اپنے بچپنوں میں ہمیشہ ممتاز رہا۔ اور کج کل ہندوستان کے گوشہ گوشہ کے مدارس۔ انجمنیں۔ کاتھولک وغیرہ اسی

دولت اہدیت سے وظائف، چنڈے۔ ماہوار میں حاصل کر کے اپنی اپنی حیات قائم رکھ کر علمی و ادبی دلچسپیوں میں مصروف ہیں۔

اور اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ حیدر آباد اردو زبان میں جو ترقی کر رہا ہے وہ آج سے سمجھی جانا چاہیے۔ اور لکنؤ کی ترقی اس سے بیشتر کی ہے، تو

اس کا جواب حیدر آباد کی قدردانیوں کے ضمن میں گذر چکا ہے تاہم مزید جواب اور سن لیجیے۔

۱۵۔ بعض انہیں ناسخ کا شاگرد بھی کہتے ہیں (عالی رفائی)

ہر کم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکنؤ سے منگائیے

(تذکرہ آب حیات پہلے دور کی تہیہ) اس دور میں دہلی تو مجلس کی شمع ہیں اور اہل مجلس دہلی اور دکن کے شریف “
”وہ نجیب فصیح زبان ہیں جو کچھ دیکھتے ہیں اسی روشنی سے دیکھتے ہیں۔ ان کی “
”زبان ایک ہی سمجھنا چاہیے۔“

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس زمانے میں بھی دکن اور دہلی کی زبان ایک ہی سمجھی گئی ہے جس زمانے میں لکھنؤ کا اس عالم میں وجود بھی نہ تھا۔
خداوند کریم آباد کے اس سلطنت کو کہ منصب۔ جاگیر۔ معاش۔ ماہوار کی وجہ ایک بڑی جماعت تلاش روزگار سے مستغنی ہے صاحب تذکرہ
آب حیات نے اس بارے میں بھی لکھ دیا ہے۔

”دہلی برباد لکھنؤ ویران۔ دونوں کے سندی اشخاص کچھ پیوند زمین ہو گئے “
”کچھ در بدر خاک بسر، اب جیسے اور شہر دیسے ہی لکھنؤ جیسے چھاؤنیوں کے “
”بازار دیسے ہی دہلی بلکہ اس سے بھی بدتر “

رنگین مزاجی اور شگفتہ دلی۔ بفکری کے کرسٹے ہیں جو طبیعت خود بخود جدت پسند اور باریک بین ہو جاتی ہے اور بفکری بقلے سر پرست
کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ مدت ہوئی کہ سلطنت اور ریاست کے ہمراہ، بفکری رنگین مزاجی۔ شگفتہ دلی۔ دہلی اور لکھنؤ سے ہمیشہ کیلئے رخصت
ہو گئیں اور جو جو خصوصیتیں کسی زمانہ میں حیدر آباد دہلی اور لکھنؤ کو متفقہ طور پر کم و بیش حاصل تھیں آج ان تمام خوش نصیبوں کا مالک ہند
واحد صرف حیدر آباد ہی ہے اور خصوصاً اردو کے لئے معمولہ ادب ہے اور شاعری اہل حیدر آباد کا عام مشغلہ ہے۔
جدید اصطلاحات و محاورات مرتب کرنیکا حق صرف دہلی و لکھنؤ پر منحصر نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ اردو کے لئے کوئی اور مرکز قرار پانا کچھ نہوت
نہیں ہے۔ جو عقائد اسلام کے موافق ابسی اور کاہنی ہونا ناممکن ہے۔

آج ہم مصلح اردو ہیں! اور ہمیں اردو میں ہر قسم کے اصطلاحات و محاورات مرتب کرنے۔ تذکیر و تانیث اور رسم الخط کے اصطلاحات
مقرر کرنے اور ہر قسم کی تراش خراش کرنیکا بخوبی حق حاصل ہے۔ اور دہلی و لکھنؤ کے جدید اصطلاحات و محاورات، جن میں پنجابیت اور پوہی پن
بڑھ رہا ہے نہ ہم انہیں مستند سمجھتے ہیں اور نہ اس کے پابند ہو سکتے ہیں۔

ہم جو مدعی زبان اردو ہیں تو اس بارے میں دہلی سے زیادہ لکھنؤ کو خلش ہے اس لئے کہ لکھنؤ کے مقابل دہلی کو اسی قسم کی ایک شکست ہو چکی
ہے۔ مگر لکھنؤ کو یہ نیا سابقہ ہے اور سابقہ بھی دلخراش !!!
مجھے اصل مضمون سے زیادہ اس رائے پر حیرت ہوتی ہے جو خان بہادر میر ناصر علی خان صاحب ایڈیٹر صلائے عام (دہلی) کی طرف سے
ختم مضمون پر شائع ہوئی ہے۔

”جناب عشرت صاحب نے یہ مضمون بڑے کام کا لکھا، کوئی کچھ کے جلے “
”اردو کی ٹکسال دہلی اور لکھنؤ ہی ہے اور رہے گی۔ اس کے سوا جو اس “

۱۰ اب اہل دہلی اور اہل لکھنؤ تلاش معاش میں سرگرم رہیں یا زبان اور شاعری میں جدتیں یا رنگینیاں دکھلائیں؟ (عالی رفائی)

اصغر علی محمد علی کا ہر عطر نہایت مشہور ہے

زبان کا دعویٰ کرے ٹکسال باہر سمجھئے

مجھے حیرت اسی وجہ سے ہے کہ خان بہادر سے ایسی امید نہ تھی جو ایک لایعقلانہ خود داری کی تائید کر جائیں گے، کیونکہ خان بہادر کو میں درموجودہ اُن دہلوی اساتذہ میں سمجھتا ہوں اور اُن ہستیوں میں شمار کرتا ہوں کہ زمانہ پیر پچاس برس پیچھے مٹ جائے تو ایسے لوگ نظر آئیں۔
ہاں شاید یہ وجہ ہو کہ عشرت صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کی تفریق عظمت برقرار رکھنے کیلئے خان بہادر کو بھی اپنا ہم توانا بنا چاہا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۳۶ پر خان بہادر کو یوں متوجہ کرتے ہیں:-

”کیونکہ آپ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، یہ ڈوبی تو ہم سب ڈوبیں گے“

اگر اہل دہلی و لکھنؤ ہماری زبان کو ٹکسال باہر سمجھتے ہیں تو اہل حیدر آباد کی نظروں میں بھی دہلی اور لکھنؤ کے جدید اصطلاحات و محاورات ادیان منسوخ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

رسالہ ”صلائے عام“ (دہلی) جلد ۱ نمبر ۱۰۰ بابت اگست ۱۹۳۶ء صفحہ ۲ پر خان بہادر کی طرف سے اسی دلیل کی ایک اور تحریر شائع ہوئی ہے:-

”یہاں ایک بات اور عرض کرنے کے قابل ہے کہ اردو کے لئے دو ہی مقام“

”معتبر سمجھنے چاہئیں۔ دہلی اور لکھنؤ۔ ان دو شہروں کے سوا جو اردو کا دعویٰ“

”کر رہے ہیں انہیں کچھ نہیں کہنا چاہیے، زبان کی توسیع کے لئے جس قدر“

”جہاں کے رہنے والے کوشش کریں چشم مار و شن دل ماشاء لیکن جب ادائے“

”بیان میں گفتگو ہو تو غیروں سے بحث مناسب نہیں، مقصود یہ ہے کہ زبان“

”کا جس قدر بہلا ہوا اچھا ہے، حضرت موجد کا شعر ہے:-“

”چاند پر خاک نہ ڈالے سے پڑیگی موجد“

”ہم کو شاعر نے کوئی تو کیا ہوتا ہے“

آپ کے خیال میں جب ہماری اردو زبان غیر معتبر ہے تو ہمارا توسیع زبان میں کوشش کرنا آپ کے چشم روشن اور آپ کا دل شاد کہاں ہوا۔ بلکہ اثر

برعکس ہوگا۔ کیونکہ ہم غیر ہیں اور اصلاح اردو تو صرف اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کا حصہ ہے اور آخر کا یہ فقرہ کہ مقصود یہ ہے کہ زبان کا جس قدر

بہلا ہوا اچھا ہے ”پر کیا معنی؟

بہر حال ایسی باتیں سوائے اس کے کہ اشتعال انگیز ثابت ہوں اور کیا تصور کی جاسکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس مضمون کو میں اپنی ایک نظم پر ختم کرتا ہوں۔

۱۷ یہاں اہل دہلی اور اہل لکھنؤ سے وہ کوثر نظر اور تنگ چشم اصحاب مراد ہیں جو محض حدیثیہ جا خود دارانہ طور پر حیدر آباد سے چشمیں کیا کرتے ہیں، وگرنہ

دہلی اور لکھنؤ کے وہ اصحاب جنہیں حقیقت بد نظر رہتی ہے اور جو اصناف کو بات سے جانے نہیں دیتے وہ مقرر ہیں کہ بیشک حیدر آباد مجمع علماء

ادیبانہ اور حیدر آباد کے ثقافت کی اردو زبان بہت صاف و شستہ ہے، لیکن یہ کلیہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ثقافت ہی کی زبان مستند ہوا

کرتی ہے اور عام زبان کہیں کی بھی مستند نہیں۔ (عارف رفاعی)

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے مذکنا چاہیے

اردو ہماری ہے

قیام جامع عثمانیہ حجت ہماری ہے کہ اردو کی یہی سلطانِ دکن کو تاجداری ہے
نگاہِ لطف نے شاہِ دکن کے یہ شرف بخشا کہ ہر تفسیر اور تحریر میں اردو ہی ہے
سند ہم اصطلاحوں میں نہ لیں گے اہل دہلی کی خود اپنی بذلہ سنجی کی مہیا ہم کو یاری ہے
دلائل لکھنؤ کے کیوں نہ ہوں تقویم پارینہ کہ جب فکرِ سائیں درہم میں سازگاری ہے
در شہوار سو ایک ایک لفظ اچھا نکالے گی ہماری طبع گوہر بار میں جب آبداری ہے
سند ہر لفظ اپنا۔ مستند ہیں بندشیں اپنی جو ہم ناسخِ زباں کے ہیں جدتِ ختیاری ہے
اگر پابند ہم خدما صفا دے ماکدر کے ہیں تو پھر اصلاح میں اردو کی ہم کو کامگاری ہے
کہی ملتے ملتے دہلی لکھنؤ پر۔ کیا ہوا آخر! ہنسنے ہم جو کوی مفت اسکی دلفکاری ہے
زبانِ حیدر آباد دکن آزاد ہونے سے کسی کو بے قراری ہو! کیکو اشکیاری ہے
دکن کے بعد دہلی اور پھر تہا لکھنؤ مصلح! دکن پر مصلح اردو ہے یہ بھی فضلِ باغی ہے

ہمارے سامنے عالی کسے دعویٰ پر اردو

ہمیں اہل زبانِ اردو ہیں "اردو ہماری ہے"

عالی رفاعی

چھپ گیا

چندروارڈ اردو شارٹ ہینڈ

چھپ گیا

ایک ماہر زود نویس کی قابل قدر رائے

مکرمی شیخ صاحب۔ اسلام علیکم رحمۃ اللہ برکاتہ۔ چندروارڈ اردو شارٹ ہینڈ کی کتاب میں نے بہ نظر تعمق پڑھی۔ واقعی کتاب سلیس اور مختصر سے مختصر لفظوں میں لکھی گئی ہے، معمولی محنت اور تھوڑے وقت میں مبتدی ایک ماہر زود نویس بن سکتا ہے واقعی اس کتاب کی مدت سے ضرورت تھی و اسلام۔ دستخط غلام حسن شارٹ ہینڈ رائٹر دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر جھنگ لئے کا پتہ الہ بخش رحیم بخش یک سیر کجرات

خیمے۔ دریاں۔ یا چرمی سامان درکار ہے یا پہلے ان کی فہرست منگا کر دیکھنا مطلوب ہے تو آج ہی

محمد حسین اینڈ کوٹنٹ مرچنٹ فتح گڑھ

کو لکھیے، بڑے بڑے روسا اور ہائی ریاست ان ہی کے یہاں سے مال منگاتے ہیں۔ ان کے یہاں مال عمدہ اور ارزاں ملتا ہے یہ مٹا لکھیے

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاج عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیے

میر قافلہ کی صدا

راہ تیری پر خطر
آہ تیری بے اثر
یاس کا دلیں گزر
خوف سے لرزاں نظر
ہار نہ ہمت مگر

تیز چلے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

جادو منزل نیا

ناقہ محمل نیا

منظر ساحل نیا

اور تو غافل نیا

عزم نیا، دل نیا

تیز چلے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

کیوں ہو گرفتار غم

دیکھ یہ نقش قدم

پڑتے ہیں جو دم بدم

دشت میں مل کر ہم

راہ بتاتے ہیں ہم

تیز چلے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

مڑے مری جان نہ دیکھ
صد بیاباں نہ دیکھ
سوئے گریبان نہ دیکھ
قار مغیلاں نہ دیکھ
ہو کے ہراساں نہ دیکھ

تیز چلے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

آہ شر رہا کر

چشم کو بیدار کر

گریہ خوینا کر

نثار کو گلزار کر

دشت کو گلزار کر

تیز چلے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

واقف اسرار ہوں

طالب آزار ہوں

تیرا نگہ دار ہوں

مولس و دلدار ہوں

میں ترا غمخوار ہوں

تیز چلے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

محمود اسراریلی

غزلیات

الکبریا

امید کے خلاف کوئی مہرباں ہے آج
دنیا مری تھی جن میں محبت سے پیشتر
وہ دل کہ جس کو سمجھے تو اک مذخون کی
اللہ صبر دے کہ مراضیہ مستقل
شاید ہے کوئی تازہ معصیت نصیب میں
کیوں مہنگوں نہ مری معصوم آرزو

شاید صنم کدے سے نکالے گئے ہیں آپ

الکبر خدا کا نام جو در زبان ہے آج

دل (شاہجہاں پوری)

اپنی ہستی ہی اک فشاہ
فشنہ پرور پھر اک گاہ ادھر
حسن کا ناز اہل دل کا نیاز
چشم جانان ترے اشارہ
آج تک وہ نظر نہیں آئے
سرگزشت فراق کیلئے
یوں مٹا مٹے داغ ناکامی
فیندا چٹ جائے جسکے سننے سے
دل سے کہتی ہے سانس کی کک

خود بخود کہنے رہی ہوں جہیں
کس کالے دل یہ آستانہ ہے

رزمی بھوپالی

نظر کو دور میں لا، ساغر شراب بنا نے شباب سے دنیا کو پر خراب بنا
 نگاہ نے جسے چمکا دیا وہ دل میں رہا جو دانستہ دل میں ابھرا وہ آفتاب بنا
 نگاہ بخودی شوق دیکھ ہی لیلیٰ ہزار ہوش کے پردوں کو تو نقاب بنا
 فروغ حسن کی نیرنگیاں معاذ اللہ، کہیں شراب بنا اور کہیں شباب بنا
 رہیں عشرت سے کیوں بزم ہستی میں اہو کو جوش دے، دل کو خم شراب بنا
 اس انفعال نے بدلی ہیں صورتیں کیا کیا کبھی گناہ بنا اور کبھی ثواب بنا
 ہزار عشق و محبت کی بستیاں اُجڑیں
 کہیں جب ایک یہ رزمی دل خراب بنا

کوثر

یہ مانا تم کو دنیا والے حسن کا آقا کہتے ہیں؛ کچھ اُن کی خبر ہی ہے تم کو جو غم میں گھلتے رہتے ہیں
 یہ آگ جو دل میں سلگتی ہے اس آگ کا نام محبت ہو سینے میں جو ہے اک شعلہ سا اس شعلے کو دل کہتے ہیں
 کیا اس سے بڑی بھی لے واعظ کوئی اور قیامت کی ہو جب آگ کے چلے جاتے ہیں وہ ہم اسکو قیامت کہتے ہیں
 جو آنکھیں تھامے جلوؤں کی تصویر اتار کر تکیں تم دیکھو تو اُن آنکھوں کو اب خون کے دریا بہتے ہیں
 شعروں سے ہمارے بھی کیا کیا ہنگامے ہوتے ہیں پیا
 نوحی نہیں ہم لیکن کوثر طوفاں اٹھاتے رہتے ہیں

کیف مراد آبادی

کیا اثر لے بخودی دید جاناں کر دیا ہستی پر جوش کو اک جسم بیاں کر دیا
 اب کہاں ظرف دل مجبور میں وہ وصلہ کیا کیا تو نے کہ زلفوں کو پریشاں کر دیا
 میرے نالوں کی معاذ اللہ یہ برہم زنی گلشن ہستی کو ہمرنگ بیا بیاں کر دیا
 قطرہ بے کیف تھا مصروفِ ذوقِ بچہ حسن کی رنگینوں نے اس کو انساں کر دیا
 تیری محفل کی یہ شورش اُن نگاہِ فتنہ گر جذبہ مجبور کو شعلہ بد اماں کر دیا
 اُس کے ہر انداز کے قرباں مجاؤ نہیں کیف
 مجھ سے کافر کو بھی لذت کیشیاں کر دیا

ہادی مچلی شہری

جب نہ چھوٹا قید کی تعزیر سے سر کو ٹکرایا کیا زنجیر سے
 کام ہی کوئی نہیں بنتا، مرا لاگ ہی تقدیر کو تدبیر سے
 ایک زخم دل میں اتنی لذتیں ایک دنیا بس گئی اک تیر سے
 اب ہر پائے شوق اور افتادگی چل گئی تدبیر کی تقدیر سے
 آسمان دیکھے زرا اپنی طرف سابقہ ہے نالہ تنگیر سے
 شاد کام اور وہ بھی میری زندگی بدگماں ہو جاؤں گا تقدیر سے
 اسکے آگے وہ سکوت بے محل کم نہ تھی حالت مری تصویر سے
 چارہ ساز و مجکو صحت ہو محال کیوں اُچھتے ہو بُری تقدیر سے
 ختم ہی ہو قصہ رنج و اُم جان ہی نکلے کسی تدبیر سے

درد دل بھی مجکو ہادی کم نہ تھا

کیوں اُچھتا کا تب تقدیر سے

یوسف کجراتی

زرا دہِ حسن کو اپنے چھپا کے دیکھتے تو لیں وہ پہلے حشر سے محشر اٹھ کے دیکھتے تو لیں
 کرنیگے عکس کو جو ہر عطا تکلم کے مگر وہ آئینہ رُخ کو بنا کے دیکھتے تو لیں
 سب بھل ہی جائیں گے اے ہوشِ حضرتِ یسوی زرا دہِ حسن کی تاثیر آ کے دیکھتے تو لیں
 کہاں کلیم کہاں طور اور کہاں یوسف وہ برق سوز نگاہیں اٹھ کے دیکھتے تو لیں

شانِ حسن

یک نظر کردی و شد ہر خمِ جنت در کنار یک ادائے ناز، شرحِ صد معامے بہار
 یک سخن گفتی و دنیا در عدم شد بقیر یک تبسم کردی و شورِ جہاں شد آشکار
 یک اشارت کردی و صد آستانِ مدِ پدید

جزیرہ دولوی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی دوکان مقبول ہند ہے

آسمانی سوار

(فسانہ)

۱۸۶۷ء کے موسم خزاں میں ایک روشن سہ پہر کے وقت ایک سوار گئے جنگل میں پڑا ہے، یہ مقام ٹرک کے ایک کنارے پر ہے جو مغربی درجنیا کو جاتی ہے۔ سوار پیٹ کے بل لیٹا ہوا ہے۔ جوتے کی نوک زمین پر کھڑی ہے۔ سر بائیں بازو پر رکھا ہوا ہے۔ پھیلا ہوا داہنا ہاتھ بخبری میں بھی اٹھل کی گرفت سے خالی نہیں صرف اعضا کی باقاعدہ طبعی حالت اور پیٹ سے بندھے ہوئے کارتوس بکس کی خفیف جنبش اس کی حیات کی تصدیق کر رہی ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے وقت سو رہا ہے اور اگر اس حالت میں دیکھ لیا جائے تو انصاف و قانون کا تقاضہ یہ ہے کہ یہی اس کی آخری منید ہو جائے۔ درختوں کے اس دلفریب اور گنجان کنج کے سامنے حد نظر تک بلند پہاڑ ہے جس کی ایک وسیع مسطح چٹان باہر کو نکلی ہوئی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں سوار کی خواب گاہ سے دور ایک عظیم الشان عمیق جنگل واقع ہے اگر کوئی ہموار چٹان سے گرے تو جنگل کے درختوں تک پہنچنے کے لئے اس کو ایک ہزار فٹ کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ سوار جس کنج میں محو خواب ہے وہ اس قدر بلندی پر واقع ہے کہ اگر وہ بیدار ہوتا تو نہ صرف چٹان اس کی نظر کے سامنے ہوتی بلکہ دامن کوہ کے غار کی پہنائی کا بھی اندازہ کر سکتا جس کی طرف ایک نظر ہی پریشانی جو اس دوران سر کے لئے کافی ہے۔

سوار کی آرام گاہ سے کچھ فاصلے پر اس کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ دن بھر کی مسافت کے بعد اب دم لیا ہے، رات کے وقت کوچ کر گئی اور اس مقام سے گزرتی ہوئی جہاں اس کا غافل سنتری پڑا ہوا ہے کوہستانی راستوں کو طے کر کے سوتے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہوگی۔ بے خبری میں دفعتاً حملہ کرنے پر کامیابی منحصر ہے۔ اگر دشمن کا کوئی سپاہی کہیں چھپا ہوا ہے اور ان کی قیام گاہ اور نقل و حرکت سے آگاہ ہو جائے تو شکست ظاہر اور ہلاکت یقینی ہے۔ درجنیا ان کی منزل مقصود ہے اور اس کی تسخیر ان کا مقصد سفر۔

محو خواب سنتری کا رٹر ڈور درجنیا کا ایک نوجوان تھا۔ متمول والدین کا فرزند لیگانہ۔ جس راحت و آرام اور تعلیم و تربیت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے وہ سب اس کو میسر تھی۔ ایک دن صبح کو ناشتہ کی میز سے اٹھتے وقت نہایت سکون و سنجیدگی کے ساتھ باپ سے بولا "ابا! ایک یونین رجمنٹ گرنیٹ میں آگئی ہے میں اس میں شامل ہونے کے لئے جاتا ہوں"

باپ نے سراٹھایا۔ بیٹے کے چہرے ایک لمحہ نظر ڈالی اور کہا "جاؤ کارٹر، اور ہر حالت میں وہی کرنا جو تمہارا فرض ہو، درجنیا جس تم جنگ کرتے ہو تمہارے بغیر باقی رہ سکتا ہے۔ اگر ہم دونوں جنگ کے بعد زندہ رہے تو اس معاملہ پر گفتگو کریں گے۔ تمہاری ماں کی حالت جیسا کہ طبیع سے تم سے بیان کر چکا ہے نہایت نازک ہے۔ چند ہفتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن یہ زمانہ نہایت قیمتی ہے۔ بہر حال اس وقت اسکو پریشان کرنا مناسب نہیں"

کارخانہ اصغر علی محمد علی کو قایم ہوئے ایک سو سال ہوئے

کارٹر ڈور نے سر تسلیم خم کیا باپ نے جس انداز سے جواب دیا وہ قلب مجروح کا پردہ پوش تھا، کارٹر اپنے گوارہ طفلی کے خلاف داد شجاعت دینے کے لئے روانہ ہو گیا

احساس فرض و دلیری، وفاداری و سرفروشی کے کارناموں نے اس کو توڑے ہی زمانہ میں ہم عمروں میں ممتاز اور افسروں کی نظر میں قیام بنا دیا۔ یہی اوصاف اور سرزمین وطن کی واقفیت تھی کہ اس کو دشمن کی سرحد پر پاسبانی کی خطرناک ڈیوٹی پر مقرر کیا گیا، لیکن گسل راہ اور خستگی سفر عوم و استقلال پر غالب آگئی اور منہ نہ آدبا یا۔

خزا جانے کس نیکی یا بدی کے فرشتے نے خواب میں آکر اس کو اس خواب مجرمانہ سے بیدار کر دیا، بغیر حرکت اور بغیر آواز کے عمیق سکوت اور شام کے آخری سکون میں کسی غیبی کاتب تقدیر نے اس کے دیدہ ہائے شعور کو مس کیا اور اس کی روح نے کانوں میں وہ پراسرار بیدار کن الفاظ پہونک دیے جو کسی انسانی ہونٹوں سے نہیں نکلے اور کسی انسانی حلقہ کو یاد نہیں۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اپنے بازو سے پیشانی کو اٹھایا اور داسنے ہاتھ سے رائفل کی گرفت کو تنگ کر کے درختوں پر نظر ڈالی۔

سب سے پہلے اس کو اس مسرت و فرحت کا احساس ہوا جو صنّاع عالم نے مناظر قدرت کے اندر پیدا کر دی ہے، پہاڑ کے پرست پائے پر سطح چٹان کے آخری کنارے پر افق آسمان کے مقابل ایک سوار کا شاندار بیت کھڑا تھا۔ انسانی مجسمہ گھوڑے پر سپاہیانہ انداز سے بیٹھا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک یونانی دیوتا سنگ مرمر سے تراشا گیا ہے۔ سوار کا ہلکا سبز لباس اخضر فلک کے ہم رنگ تھا، اس کا چہرہ کسی قدر بائیں جانب مڑا ہوا تھا۔ کینٹی اور واٹر ہی کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ وہ نیچے کی عمیق و وسیع دادی کی طرف دیکھ رہا تھا، سوار کی فلک پیمابندی اور قرب دشمن کے احتمال و خوف نے سپاہی کی نظر میں اس مجسمہ کو نہایت ہیبت ناک بنا دیا۔

ایک لمحہ کے لئے کارٹر ڈور کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اختتام جنگ تک سوتا رہا ہے اور یہ مجسمہ یادگار فتح کے طور پر بلندی کوہ پر نصب کیا گیا ہے لیکن یہ احساس مجسمہ کی خفیف حرکت سے فوراً باطل ہو گیا، گھوڑے نے بغیر پاؤں کو حرکت دیے اپنے جسم کو پیچھے کی طرف کھینچا۔ سوار بدستور بحسن حرکت رہا۔

کارٹر کے حواس درست ہو گئے، خواب، خیال ہو گیا اور موقع کی اہمیت و نزاکت کو دیکھ کر اس نے رائفل کا نشانہ درست کیا۔ نال کو جھاڑیوں کے اندر سے نکال کر گھوڑا چڑھالیا اور سوار کے سینے کو ہت کے لئے انتخاب کر لیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ انگلی سے ایک اشارہ بھی کر دیتا، لیکن اس لمحہ میں سوار نے سر کو جنبش دی اور پوشیدہ دشمن سپاہی کی طرف دیکھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نگاہیں سپاہی کے چہرے آنکھوں اور دل کے اندر سرایت کر رہی ہیں۔

کیا جنگ میں دشمن کو ہلاک کرنا اس قدر خوفناک ہے۔ خصوصاً آپے دشمن کو جس نے دفعتاً اس راز کو معلوم کر لیا ہے جو ہماری اور ہماری فوج کی حفاظت کا ضامن ہے۔ آپے دشمن کو جو اپنے علم و آگاہی کے سبب سے اپنی کثیر التعداد فوج سے زیادہ خطرناک ہے! کارٹر پر موت کی سی زردی چھا گئی۔ غصہ سے ہر عضو کانپنے لگا۔ چکر آنے لگے اور سوار کا مجسمہ اب نظر آنے لگا گیا ایک تصویر ہے جو آتش آسمان کے

اندر چکر لگا رہی ہے، بات کی گرفت رائفل پر سے سست ہو گئی اور سر آہستہ آہستہ جھک کر زمین پر پڑی ہوئی تینوں پر جا لگا، شجاع، جوان اور جرمی سپاہی کو جوش جذبات سے مغلوب ہو کر غش آ رہا ہے۔

یہ حالت دیر تک نہ رہی دوسرے ہی لمحہ میں اس کا سر زمین سے اٹھا، ہاتھ رائفل پر اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے، انگلی نے گھوڑے کو تلاش کر لیا دماغ، دل، نظر دست ہو گئی، ہوش و خرد ٹھکانے آ گئے، غنیم کے سوار کو گرفتار کر لینا ناممکن تھا۔ اور ہوشیار کر دینا اپنی ہلاکت کا موجب سپاہی کا فرض ظاہر تھا۔ جھاڑی کے اندر ہی سے سوار کو ہت بندوق بنا دینا چاہیے۔ بغیر اطلاع کے بغیر ایک لمحہ تیاری مرگ کے۔ بغیر ایک وقفہ دعائے آخری کے اس کو اس خطرناک مخبری و راز جوئی کی نذر اپنی چاہیے، لیکن نہیں ایک زرا سی امید باقی ہے۔ ممکن ہے اس نے کچھ نہ دیکھا ہو۔ ممکن ہے وہ محض مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے آیا ہو، اگر موقع دیا جائے تو وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے گا اور یقیناً اس کے اندر مراجعت سے ظاہر ہو جائیگا کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ اب کارٹرنے پر مجسمہ سوار و اسپ پر نظر جانی اور اس کے گھوڑے کو نشانہ بنانے کے لئے تاکا۔ یکایک اس کے دماغ میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس کے باپ نے رخصت کے وقت کہے تھے کہ ”ہر حالت میں وہی کرتا جو تمہارا فرض ہو“ ان الفاظ نے ایک سکون پیدا کر دیا۔ دانت عجم و استقلال کے ساتھ بند ہو گئے۔ اعضا ایک محو خواب بچہ کی طرح ساکن ہو گئے، نبض اصلی رفتار پر آ گئی، سانس کی آمد و رفت میں باقاعدگی پیدا ہو گئی، فرض شناسی نے فتح پائی، روح نے جسم سے کہا ”ٹھہر اور خاموش ہو“ اور اس نے فیر کر دیا۔

کارٹرنے کی فوج کا ایک افسر جو محض تفریح کی غرض سے یا معلومات حاصل کرنے کے لئے کیمپ سے کلکٹر مہرودن سیر و گردش تھا اس پہاڑ کے قریب پہنچا اور اس لمحہ میں جب کارٹرنے فیر کیا افسر کی نظر اٹھی اور ایک حیرت ناک منظر نظر آیا۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار فضائے آسمانی سے گذرنا ہوا ددی کی طرف جارہا ہے۔ سوار سپاہیانہ وقار کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر جا بیٹھا ہے۔ لگام کو پوری قوت سے پکڑے ہوئے ہے کہ گھوڑا اس ہبوط میں غیر ضروری عجلت سے کام نہ لے، برہنہ سر پر لمبے بال ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ داہنا ہاتھ گھوڑے کی اٹھی ہوئی ایال کے بادل میں پوشیدہ ہے۔ گھوڑے کا جسم ایسا ہموار ہے کہ گویا ہر قدم زمین پر پڑ رہا ہے۔

اب آسمانی سوار کے نظارہ سے افسر پر اس درجہ حیرت و مہیبت طاری ہوئی کہ ٹانگوں میں لرزش پیدا ہو گئی اور گر پڑا۔ تقریباً اسی لمحہ میں وادی کے درختوں میں ایک آواز پیدا ہوئی اور پھر سکوت چھا گیا۔ افسر لڑکھاتا ہوا اٹھا اور اس نظارہ پر خواب کا گمان کرتا ہوا کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور اس خیال سے کہ ایک ناقابل یقین واقعہ کو بیان کرنا اقرار جہالت کا مترادف ہے خاموش رہا اور کسی سے کچھ نہ کہا۔

کارٹرنے نے فیر کرنے کے بعد رائفل کو پہر بہر لیا اور باسبانی شروع کر دی مشکل سے دس منٹ گزرے ہونگے کہ اس کی فوج کا ایک سارجنٹ آہستہ آہستہ ہاتوں اور گھٹنوں کے بل سرکنا ہوا اس کے قریب پہنچا، کارٹرنے اس کی طرف مطلق اعتنائے کی اور بدستور بحیرہ حرکت لیتا رہا۔

”کیا تم نے فیہ کیا تھا؟“ سارجنٹ نے آہستہ سے سوال کیا۔

”ہاں“

”کس پر؟“

”ایک گھوڑے پر۔ وہ سامنے کی چٹان پر کھڑا تھا۔ دیکھو اب نظر نہیں آتا۔ نیچے غار میں گر پڑا“ کارٹر کا چہرہ سفید تھا۔ لیکن اس نے اپنے تلاطم جذبات کو چھپا رکھا۔ جواب دیکر منہ پھیر لیا اور خاموش ہو گیا۔ سارجنٹ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد بولا ”ڈروزا دہر دیکھو۔ چھپانیکی ضرورت نہیں۔ میں حکم دیتا ہوں کہ رپورٹ دو کیا گھوڑے پر کوئی شخص سوار تھا؟“

”ہاں“

”کون؟“

”میرا باپ“

سارجنٹ اچھل پڑا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ”اللہ اللہ!“ اور یہ لکھر خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

حامد حسن قادری بچھرا یونی

(ترجمہ)

دنیا صحافت میں انقلاب عظیم

روزنامہ الکلام منگلور کا پہلا نمبر

۱۹۲۶ء کو نہایت شاندار پیمانہ پر ملک کے سحرانوار دیوبند کی زیر ادارت

پچیس ہزار کی تعداد میں شائع ہو گا

سیاست حاضرہ بہترین مضامین بریکنگ پیراز معلومات بہترب و پیش

دور دکن نظیر تفریح بنیے حیرت انگیز فسانے ملکی و عیسائی

بروز راست حاصل کی ہوئی خبروں

درج اخبار ہوا کرے گی

یقیناً یہ اخبار سارے دکن میں اپنی طرز کا واحد اور پہلا اخبار ہو گا

اپنے شہر سے کہیں علم دوست اور لائق اجاب کے ترور نہ کرے نہ والوں کو

ایک دلچسپ ناول مفت دی جائیگی

مشہرین

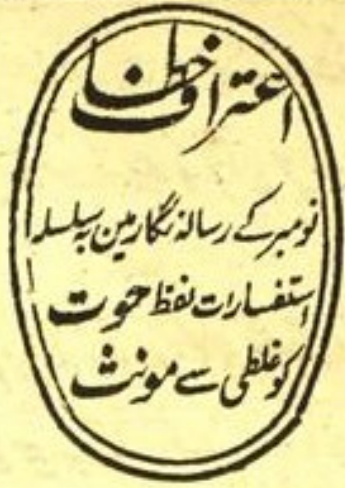
کو دکن میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کیلئے یہ زرین موقع ہے

جلد از جلد پہلے نمبر میں اپنی شہنشاہوں کیلئے جگہیں مخصوص کرالیں

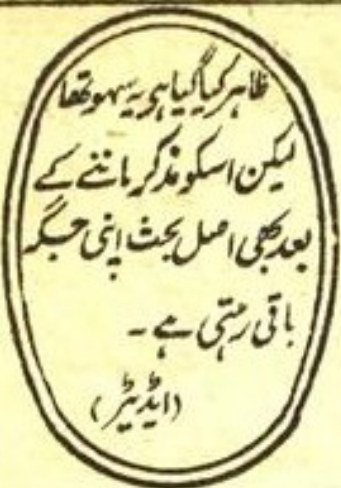
زخامہ اشتہارات اور نمونہ حسب آراء آج ہی

مفت طلب کیجئے

بیتھ میگزین آراء الکلام منگلور



استفسارات



قرآن اور اس کا غلط جغرافیہ

(یہ جواب استفسار سٹریج مارٹن مندرجہ نگار ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء)

(نگار) آپ نے سب سے پہلی غلطی تو عنوان قائم کرنے میں کی ہے، کیونکہ آپ کے اعتراضات کا تعلق زیادہ ترجیاً لوجی (طبقات الارض) سے ہے نہ کہ جغرافیہ سے اور دوسری غلطی یہ کی ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے بد غلط جغرافیہ "میں اپنے احادیث کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جو بالکل اصول بحث کے خلاف ہے پر آپ نے یہ ظلم اور کیا ہے کہ نہ احادیث کی اصل عبارت درج کی اور نہ قرآن مجید کی۔ لیکن چونکہ قرآن کی آیات کے ذکر میں آپ نے سورہ کا حوالہ دیدیا ہے اس لئے انھیں تو میں نے ڈھونڈ نکالا، لیکن احادیث کے متعلق چونکہ اس قدر تحریر کی بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ کہاں اور کس کتاب میں آپ نے دیکھا ہے اس لئے میں نے خود اس خدمت کو انجام دینا مناسب نہیں سمجھا، جو آپ کو کرنی چاہیے تھی۔ اس لئے جواب میں صرف کلام مجید کی ان آیات سے بحث کروں گا۔ جن کے مطالب پر آپ کو غلط جغرافیہ، کا شبہ ہوا ہے اور احادیث سے اس وقت کوئی گفتگو نہ کروں گا جب تک آپ ان کا پورا حوالہ نہ دیں اور اصل عبارت نہ نقل کریں۔

(۱) آپ کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ کلام مجید (سورہ طلاق) میں لکھا ہے کہ خدا نے سات آسمان پیدا کئے اور اتنی ہی زمینیں اسی کے ساتھ اپنے ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں طبقات زمین کے باشندوں، کرہ ارض کا ایک فرشتہ کے کندھے پر قائم ہونا اور اسی طرح کی اور چند بے سربا باتوں کا ذکر کیا ہے۔ میں اس حدیث یا کسی اور عالم کے قول سے اس جگہ کوئی گفتگو نہ کروں گا، کیوں کہ اول تو آپ نے نہ اصل عبارت نقل کی ہے اور نہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ حدیث آپ نے کہاں دیکھی اور دوسری یہ کہ اس قسم کی حدیثیں اکثر نامعتبر و موضوع ہیں اور درایتاً پایہ تحقیق سے گری ہوئی ہیں، لیکن سورہ طلاق کی اس آیت کا مفہوم ضرور آپ کو بتاؤں گا جس میں سات آسمان اور سات زمینوں کے پیدا کر نیکاحال درج ہے۔

(کلام مجید کی آیت یہ ہے)

اندر اللہ ذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلہن تینزل الامریا
لعلیوان السد علی کل شیء قدیر وان السد قد احاط بكل شیء
علماء - (سورہ طلاق - آیت ۱۲)

اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کلام مجید میں آسمان و زمین کی تعداد سات بتائی گئی ہے حالانکہ آسمان کا کوئی وجود فی الخارج نہیں ہے

زمین صرف ایک ہے اور اگر سات زمینوں سے اس کے طبقے مراد ہوں تو یہی یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ اس کے طبقات خدا جانے کتنے ہیں۔
کلام مجید میں آسمان یا سماء و سموات کا ذکر بہت جگہ آیا ہے اور ان پر غور کیا جائے تو آسانی سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قرآن میں جو مفہوم آسمان کا بتایا گیا ہے وہ کسی طرح موجودہ نظریہ کے منافی نہیں ہے۔

۶۔ بی زبان میں لفظ سماء آسمان کے لئے کوئی اصطلاحی لفظ نہیں ہے بلکہ ہر اس منظر کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بلند نظر آئے۔ چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کلام مجید میں کہیں لفظ سماء بول کر صرف بادل مراد لئے گئے ہیں جیسے او کصیب من السماء یا انزل من السماء ماء میں اور کہیں صرف فضائے بسیط مقصود ہے جیسے ثم استوی الی السماء وہی دھان میں۔

اس لئے یہ بحث طلب امر رہ جاتا ہے کہ اگر سماء یا سموات سے مراد صرف فضاء بلند ہے تو سورہ طلاق میں سبع سموات کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟
۶۔ بی زبان میں الفاظ سبع (سات) سبعین (ستر) اور سبع مائے (سات سو) جس طرح محدود عدد کے اظہار کے لئے آتے ہیں اسی طرح بعض جگہ ان سے صرف اظہار کثرت مراد ہوتا ہے، یعنی سات، ستر وغیرہ بول کے صرف کثرت کا ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ سورہ برات میں ارشاد ہوتا ہے ان تستغفر لہم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لہم (اگر تم ان کے لئے ستر مرتبہ مغفرت طلب کرو گے تو خدا انہیں معاف نہ کریگا) ظاہر ہے کہ یہاں ستر سے مراد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم کتنی ہی مرتبہ طلب مغفرت کرو لیکن اللہ معاف نہ کریگا، کیونکہ اگر عدد معین مراد ہو گا تو یہ معنی ہونگے کہ اگر ستر مرتبہ کے بعد اکثر میں مرتبہ مغفرت طلب کی گئی تو اللہ معاف کر دیگا، جو بالکل لغو و مہمل بات ہے۔

الغرض اول تو سورہ طلاق کی اس آیت میں سبع کے معنی سات کے نہیں ہیں بلکہ محض کثرت کے اظہار کے لئے آیا ہے اور اس بنا پر یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے بہت سے آسمان بنائے اور بہت زمینیں پیدا کیں، اس لئے اب تحقیق طلب صرف سموات اور ارض کا مفہوم رہ جاتا ہے۔ سو اس کے متعلق جس وقت کلام مجید کی آیات پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سماء بادل اور بلندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح مدار کے معنی میں بھی آیا ہے (مدار سے مراد وہ خط ہے جس پر ایک سیارہ گردش کرتا ہے۔ اور جسے انگریزی میں circle کہتے ہیں) چنانچہ ایک جگہ نہایت صاف صاف بجائے سموات کے لفظ طریق (راستے) استعمال کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو سورہ مومنون آیت ۱۷ (ولقد خلقنا فو قکم سبع طرائق) یعنی بنائے ہم نے تمہارے اوپر فضا میں بہت سے راستے یا مدار جن پر سیارے گردش کرتے ہیں۔ تفسیر بیضاوی میں میں بھی لفظ سماء کے تحقیق اس طرح کی گئی ہے۔

”والمراد بالسماء ہذہ الاجرام العلویۃ او جہات العلو“ یعنی سماء سے مراد اجرام علوی (کواکب و سیار) ہیں یا بلند اطراف۔
سورہ الذاریات میں ارشاد ہوتا ہے ”والسماء ذات الجہک“ جبکہ جمع ہے جبکہ کی اور جبکہ کہتے ہیں راستہ کو، اس لئے یہاں سماء سے مراد ہوئی وہ فضا جس میں سیاروں کے راستے یا مدار واقع ہوئے ہیں۔

اب رہ گیا یہ امر کہ اگر سورہ طلاق کی اس آیت میں سموات سے سیاروں کے مدار مراد ہیں تو اس کا کیا مطلب ہو گا کہ زمینیں بھی اتنی ہی پیدا کی گئیں، سو امام راعب نے اس کا بہترین فیصلہ کیا ہے کہ ”ہر سما ایک فلک ہے اپنے تحت کے لحاظ سے اور زمین ہے اپنے فوق کے لحاظ سے“ یعنی ہر سیارہ جس طرح نیچے واقع ہوئیو اے سیارہ کے لحاظ سے فلک کا حکم رکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے سے

بلند واقع ہونے والے سیارہ کے لحاظ سے زمین کا حکم رکھتا ہے اور اس لئے خدا کا یہ ارشاد کہ جتنے ہم نے افلاک بنائے اتنی ہی زمینیں پیدا کیں بالکل حقیقت کے موافق ہے۔

اگر بتبع کے معنی یہاں سات کے لئے جائیں تو یہی بادرست نہیں کیونکہ بتبع سیارہ کا علم اس وقت بھی لوگوں کو تھا اور اس لحاظ سے سورہ طلاق کی یہ آیت گویا اس وقت کے دریافت شدہ نظام شمسی سے بحث کرتی ہے۔

(۲) آپ کا دوسرا اعتراض سورہ نحل کی کسی آیت پر ہے جس کو آپ نے نقل تو نہیں کیا لیکن اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ”خدا نے زمین پر پہاڑ بنائے تاکہ وہ جنبش میں نہ آئے“ تلاش سے صرف ایک آیت سورہ نحل میں ایسی ملی ہے جہاں پہاڑوں کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:-

والتقى في الارض رداسي ان تميد بكم

آپ نے اس کا ترجمہ مفہوم خدا معلوم کس انگریزی مترجم و مفسر کی کتاب سے اخذ کیا ہے، اگر آپ اس کے حقیقی مطلب کو سمجھ لیتے تو بجائے کسی شبہ کے آپ کو قرآن کے کلام الہی ہو نیکاً یقین ہو جاتا کیونکہ یہ آیت زمین اور پہاڑ کی نسبت وہی معلومات پیش کرتی ہے جو علماء طبقات الارض نے دریافت کی ہے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے زمین میں پہاڑ پیدا کر دیے تاکہ وہ جنبش میں نہ آئے اس حال میں کہ تم اس پر آباد ہو۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ زمین پہلے بالکل ہتھکڑی اور اضطراب کی حالت میں تھی اور اس قابل نہ تھی کہ انسان اس پر آباد ہو سکتا، لیکن جب رفتہ رفتہ اس میں انجمادی کیفیت پیدا ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی جھریاں منجمد ہو کر پہاڑ بن گئیں تو وہ انسانی آبادی کے قابل بن سکی اور پھر اس کی کیفیت ہتھکڑی جاتی رہی التقى في الارض رداسي سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ زمین کی مضطرب حالت کو دور کیا گیا، یہاں تک کہ اس میں پہاڑ پیدا ہو گئے۔ اور ان تمید بکم سے مراد یہ ہے کہ زمین انسانی آبادی کے قابل بن گئی۔

(۳) آپ کے تیسرے اعتراض میں غالباً سورہ حجر کی حسب ذیل آیات کی طرف اشارہ ہے۔

”ولقد جعلنا في السماء بروجا وزينا للناظرين

وحفظنا ما من كل شيطان رجيم. الامن

استرق السمع فاتبعه شهاب مبين “

آپ نے ان آیات کے سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ کے مبعوث ہونے سے قبل عرب میں کاهنوں کی بڑی کثرت تھی جو طح طرح کی پیشین گوئیاں کر کے لوگوں کو ڈراتے دہمتے تھے۔ وہ مدعی تھے کہ ان کے موکل یا جن آسمان کی باتیں سن سُن کر انھیں بتاتے ہیں اور سیاروں کی حرکت اور بروج کے مطالعہ سے سعد و خس ساعتوں کا علم انھیں ہوتا ہے۔

ان آیات میں بروج سے وہی مہیت کے برج مراد ہیں (نہ کہ نشانیاں جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے) اور اسی زبان و اصطلاح میں ان کاهنوں کا

۱۷ جے مارٹن صاحب نے اس سورہ کا نام انگریزی میں ”Hymn“ لکھا، حالانکہ فی الاصل یہ لفظ حجر ہے اور اسے ”Hymn“ لکھنا چاہیے تھا۔ یہ ہر ہمارے معترض کی قابلیت کا عالم (ایڈیٹر)

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا جاتا ہے

حال بیان کیا گیا ہے جو اس وقت مستعمل تھی۔ شیطان رجیم سے کاہن مراد ہیں یا وہ موکل جن کو وہ اپنا تابع بتاتے تھے۔ لفظ رجیم نہایت لطیف اشارہ اُن کی جھوٹی پیشین گوئی کی طرف کرتا ہے جیسا کہ اس طرح کی لغو پیشین گوئی کو رجیم للغیب بھی کہتے ہیں۔ سورہ ملک کی ایک آیت سے اور زیادہ اسکی تصدیق ہوتی ہے ملاحظہ ہو آیت ۱۵۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا لِلدِّينَارِ الْمِصْبَاحَ وَجَلَدْنَا رِجْلَهُ لِّلشَّيَاطِينِ ۝

اس آیت میں نمایاں طور پر کاہنوں کو شیاطین اور اُن کی پیشین گوئی کو رجیم بالغیب کہا گیا ہے۔

استراق السمع سے مراد کاہنوں کی وہ بعض باتیں ہیں جو علم ہیت کے رو سے (مثلاً کسوف و فسوف کی پیشین گوئیاں) صحیح اترتی تھیں اور شہاب مبین سے مدعا واقعی انگارہ یا ٹوٹنے والا ستارہ نہیں ہے بلکہ مجازاً بمعنی خسران و ناکامی، تباہی و بربادی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ اُس وقت لوگوں کا یہی عقیدہ تھا کہ جب ستارے ٹوٹتے ہیں تو ضرور کوئی آفت آتی ہے۔

اب ان آیات کا مفہوم یہ ہوا کہ آسمان میں جو بروج ہیں اُن کے متعلق کاہنوں کا یہ کہنا کہ اُن پر اُنہیل اقتدار حاصل ہے بالکل غلط ہے کیونکہ خدا نے اُن کو رجیم بالغیب کرنے والے اور محض ظن و گمان پر پیشین گوئیاں کرنے والے کاہنوں کی دسترس سے محفوظ رکھا ہے اور اگر کہی کہی کوئی پیشین گوئی اُن کی (مثلاً کسوف یا خسوف وغیرہ کے متعلق) صحیح ہو جاتی ہے تو اس پر قیاس کر کے اور باتوں پر ہر وہ نہ کرنا چاہیے، کیونکہ وہ تو ایسی ہیں جن کو شہاب مبین نے باطل کر دیا ہے۔ شہاب مبین سے مراد یہاں اسلام و قرآن ہے نہ کہ ٹوٹنے والا ستارہ۔ چونکہ یہاں ذکر بروج وغیرہ کا تھا اس لئے اُسے شہاب مبین کہا گیا۔ جو اسلوب بیان کی پاکیزگی کی آخری حد ہے اور جس سے اُن کے اس اعتقاد کی طرف بھی لطیف اشارہ ہوتا ہے کہ ستاروں کے ٹوٹنے کو وہ بربادی کی علامت سمجھتے تھے۔

(۴) آپ کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں روزہ رکھنے کے متعلق یہ حکم ہے کہ جب سفید خط سیاہ خط سے نمودار ہو تو روزہ شروع کیا جائے اور ات تک اُس کو جاری رکھا جائے لیکن شمالی ممالک میں جہاں مغتوں کا دن ہوتا ہے اس پر عمل ناممکن ہے اور اس لئے اسلام کی تعلیم ایسی نہیں ہے جس پر ہر ملک کا انسان عمل کر سکے۔

خط ابیض کا خط اسود سے نمودار ہونا، صرف طلوع صبح کے معنی رکھتا ہے اس لئے روزہ کا حکم یہ ہوا کہ طلوع صبح سے اُس کی ابتدا کرو اور شام کو ختم کر دو۔ یا با الفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ پورے دن ہر روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ شمالی ممالک میں جہاں دن بہت طویل ہوتے ہیں یقیناً اس پر عمل نہیں ہو سکتا، لیکن جہاں کلام مجید میں یہ ہدایت کی گئی ہے، وہیں اور احکام بھی قابل غور ہیں مثلاً ارشاد ہوتا ہوا۔

”کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ اَيُّهَا مَعْدُودَاتُ“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ کی میعاد صرف محدود متعین دنوں تک محدود ہے اور وہ مہینہ سے متجاوز نہیں ہو سکتا، پھر جن ممالک میں مہینوں آفتاب غروب نہیں ہوتا وہاں دن کا شمار طلوع و غروب کے حساب سے نہیں ہوتا اور نہ اس حساب سے مہینہ متعین کیا جاتا ہے بلکہ اسی ایک طویل دن کے ٹکڑے کر کے متعدد شب و روز متعین کئے جاتے ہیں اس لئے ایسے ممالک میں روزہ کا حکم بھی اسی تعین کے لحاظ سے ہوگا اور جس طرح تمام کاروبار میں عمل و راحت کی تفریق ہوگی اسی طرح روزہ کی بھی تعین ہوگی۔

کلام پاک میں ایک اور آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سال وغیرہ کا حساب کرنے میں طلوع قمر کا لحاظ کیا جائے نہ کہ طلوع شمس کا، ارشاد ہوتا ہے۔
 ”ہو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نوراً وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب“

اس میں قدرہ کی ضمیر قمر کی طرف راجع ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سالوں کا حساب چاند کی مقررہ منازل کے لحاظ سے کیا جائیگا۔ نہ کہ آفتاب کے طلوع وغروب سے۔ اس لئے شمالی ممالک میں جہاں دن بہت طویل ہوتا ہے اگر چاند کے منازل کے لحاظ سے حساب کیا جائیگا تو روزہ دیا ہی آسان ہو جائیگا جیسا دوسرے ممالک میں (اگر آپ کو چاند کے ان منازل کے سمجھنے میں اشکال واقع ہو تو مجھ سے دریافت فرما سکتے ہیں)

علاوہ اس کے لایکلف اللہ نفساً الا وسعاً سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے ممالک میں ایام صیام کی تعیین اسی انداز سے کی جائیگی جو معتدل ممالک میں رائج ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ سے صحابہ نے دریافت کیا کہ ”اے رسول اللہ ایسے ملکوں میں جہاں دن ایک ماہ یا اس سے زیادہ کا ہوتا ہے، وہاں روزہ کا کیا حکم ہوگا، آپ نے فرمایا کہ ”اپنے دن کے لحاظ سے اس کے تقسیم کر لینی چاہیے“
 کیا اب بھی جے مارٹن صاحب یہ اعتراض کریں گے کہ رسول اللہ اور اس زمانہ کے لوگ اس حقیقت سے ناواقف تھے، کہ شامی ممالک میں دن بہت طویل ہوتا ہے، اور کیا ان آیات کے ہوتے ہوئے بھی ان کو یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ احکام اسلام دنیا کے لئے ناقابل عمل ہیں۔

چار کتابیں

الفاروق۔ مکمل ہر دو حصہ مع نقشہ دنیائے اسلام، علامہ شبلی کی سیرت حضرت عمرؓ پر مشہور کتاب، پیر

ابو مسلم خراسانی جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ، ج

نقشہ ارتشنگ جلال الدین صاحب اکبر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ، پیر

خطوط شبلی عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام قیمت ۵۰

میں بنگار بھوپال

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایے

کتاب موصولہ

نفسیات ترغیب | نفسیات کا علم بہت وسیع ہے اور اس کے ماتحت متعدد مباحث زیر غور آسکتے ہیں جو مستقلاً ایک فن یا علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے یقیناً کوئی ایک شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ اس نے فن نفسیات پر کافی عبور حاصل کر لیا ہے۔ یا وہ اس فن کی تمام شعبوں پر باہر آنے نظر رکھتا ہے۔ یورپ میں اس کے منشعبات پر مختلف لوگوں نے اختصاصی مہارت حاصل کر کے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی ہیں اور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس وقت تک اس فن کی تحقیق و تفتیش مکمل ہو کر اس کی تمام شاخوں کا احاطہ ہو سکا ہے۔

اُردو میں سب سے پہلے مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے دریا بادی نے علم نفس کے شعبہ جذبات و اجتماع کے متعلق اپنی گرانقدر تالیفات پیش کیں اور اسی وقت سے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ حلقہ مصنفین و مؤلفین میں اس نوع کے علوم کو اُردو میں منتقل کر نیک خیال پیدا ہوا۔

کتاب زیر تبصرہ بھی علم النفس ہی کی کتاب ہے جو اس کے ایک شعبہ یعنی ترغیب کی ماہیت نفسی اور اس کے مظاہر و کوائف سے بحث کرتی ہے۔ اس کتاب کا اصل ماخذ مسٹر میکفرش کی انگریزی تالیف "Psychology of Persuasion" ہے لیکن اس کے ساتھ فاضل مولف سید و ہاج الدین احمد کنتوری پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن نے دیگر تصانیف و مقالات سے بھی استفادہ کیا ہے جس سے بقول عبدالماجد صاحب "یہ کتاب ترجمہ نہیں رہی بلکہ اچھی خاصی تالیف بن گئی ہے" اس کتاب کے آٹھ باب ہیں جن میں ترغیب کی ماہیت نفسی اور اس کے مختلف صورتوں سے بحث کی ہے، میں نے اس کتاب کے پانچویں چھٹے، اور ساتویں باب کو نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ جن میں ترغیب فنون لطیفہ، ترغیب انتہارات و اخبارات، اور ترغیب ظرافت و خوش طبعی وغیرہ سے بحث کر کے بعض مثالوں کے ذریعہ سے بہت پر لطف بنایا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اس سے زیادہ سنگین و سہل انداز میں مرتب ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ اسلوب بیان اور طرز تحریر بھی بہت کافی دلچسپ ہے۔

یہ کتاب نہ صرف طلبہ نفسیات اور ان حضرات کے مطالعہ میں آتی چاہیے جنہیں علمی مباحث سے لگاؤ ہے، بلکہ میرے نزدیک کاروباری لوگوں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کیونکہ تجارت کی کامیابی کا راز بھی ترغیب و تشویق ہی میں پنہاں ہے اور اگر ہم علمی حیثیت سے اس کا مطالعہ کریں تو عملی زندگی میں اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

یہ کتاب ۱۱ صفحات کو محیط ہے اور دور و پیہ میں دارالمصنفین عظیم گڑھ سے مل سکتی ہے۔

خطوط شبلی | یہ مجموعہ ہے مولانا شبلی کے صرف ان خطوط کا جو انھوں نے بمبئی کی دو نہایت مشہور خاتونوں (زہرا بیگم فیضی اور

عطیہ بگم فیضی کے نام لکھے تھے۔ بڑا حصہ ان خطوط کا ہے جن میں عطیہ بگم سے خطاب کیا گیا ہے اور غالباً یہی حصہ زیادہ پر لطف ہے کیونکہ مولانا کو عطیہ کے ساتھ بہت لطف تھا، اور اسی لئے ان میں کہیں نہ کہیں نہ صرف شاعرانہ بلکہ والہانہ کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک شخص جب خط لکھتا ہے تو یہ خیال اس کے سامنے نہیں ہوتا کہ کہی یہ شائع بھی ہوں گے اس لئے اس میں وہ بہت سی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جن سے اس کی زندگی اور اس کے جذبات پر نہایت صحیح روشنی پڑتی ہے اور یقیناً اس مجموعہ میں بعض خطوط مولانا شبلی کے بھی ایسے ہیں جن سے ان کے ذوق رنگین کا پورا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس حال میں لکھے گئے ہیں کہ مولانا شبلی اس واقعہ سے خالی اندھن تھے کہ کہی یہ شائع بھی ہوں گے۔

مولوی محمد امین صاحب زبیری اور سید محمد یوسف صاحب قیصر کا ملک کو ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ان خطوط کو یکجا کر کے شائع کر دیا۔ اس مجموعہ لطیف کی قیمت ایک روپیہ ہے اور دفتر نگار سے مل سکتا ہے۔

یاد ایام مولوی عبدالحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی مشہور تصنیف ہے جو اس سے قبل تعلیمی کانفرنس علی گڑھ کی طرف سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ اب اس کو شبلی بک ڈپو لکھنؤ سے دوبارہ شائع کیا ہے اور قابل قدر اضافہ یہ کیا ہے کہ مولانا مرحوم کے حالات زندگی بھی ان کے صاحبزادہ مولوی سید عبدالعلی ندوی سے مرتب کر کے شامل کر دیے ہیں۔

گجرات کی اسلامی تاریخ اور وہاں کے علماء و مشائخ کے حالات میں اس سے بہتر کوئی تصنیف اس سے قبل شائع نہیں ہوئی، مولانا عبدالحی مرحوم کی عکسی تصویر بھی اس میں لگا دی گئی ہے قیمت ہم مقرر ہے جو ۲ صفحات کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے یقیناً زائد ہے۔

اصلاح سخن جناب شوق ندوی نے اپنی چند غزلیں ملک کے بعض مشہور اساتذہ سخن کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیجی تھیں اور اب ان سب اصلاحوں کو یکجا کر کے اصلاح سخن کے نام سے شائع کیا ہے۔ خیال اچھوتا تھا، لیکن بہتر ہوتا اگر شوق صاحب ہر استاد کو اس امر کی بھی اطلاع دیدیتے کہ وہ اسی غزل کو دیگر حضرات کے پاس بھی بھیج رہے ہیں اور بعد کو وہ یہ تمام اصلاحیں یکجا شائع کریں گے تاکہ لوگ زیادہ محنت و کاوش سے کام لیکر اصلاح دیتے۔

اس مجموعہ میں بعض اساتذہ کے خطوط بھی ہیں اور ان میں سے چند یقیناً ایسے ہیں جنہیں کبھی نہ شائع کرنا چاہیے تھا۔ مجھے شوق صاحب کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔

کتاب یقیناً بہت دلچسپ ہے اور ایک ہی وقت میں ایک ہی شعر کے متعلق مختلف اساتذہ کی مختلف رائیں معلوم کر کے بہت لطف آتا ہے کتابت طباعت کا نہایت دلکش اہتمام کیا گیا ہے اور غالباً دو روپیہ میں جناب شوق ندوی محلہ متھوانہ سندیلہ سے مل سکتی ہے۔

احمد خاں وغیرہ آقا کرمانی بی۔ اے نے جو مدرسہ عالیہ حیدرآباد میں فارسی کے مدرس ہیں، فارسی زبان میں ایک افسانہ اس نام سے شائع کیا ہے، میں قصص و حکایات کی کتابیں بہت کم پڑھتا ہوں اور اس کو بھی بالاستیعاب پڑھنے کا ارادہ نہ تھا، لیکن جب ریویو کی غرض سے میں نے اس کے ابتدائی چند صفحات دیکھے تو میں مجبور ہو گیا کہ اس کو ایک ہی نشست میں ختم کر دوں۔

اس رومان کا پلاٹ اس قدر دلچسپ اور بعض مفید مباحث پر اس درجہ لطیف انداز سے بحث کی گئی ہے کہ فاضل مصنف کے زور قلم کی

داد دینی ہی پڑتی ہے۔

زبان کے لحاظ سے کچھ کہنا بیکار ہے کیونکہ مصنف ایرانی ہیں اور اچھا ذوق انشا رکھتے ہیں، وہ لوگ جو جدید فارسی کے محاورات و الفاظ سیکنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا، اور جو حضرات صرف پلاٹ کی خوبی اور افسانہ کی ندرت کو دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس میں بہت کچھ سامان دلچسپی موجود ہے، کم از کم مجھے تو اس کا پلاٹ اس قدر اچھا معلوم ہوا ہے کہ اگر میں کسی قلم بنانیوالی کمپنی کا مالک ہوتا تو یقیناً اس افسانہ کو صورتِ تحریر میں منتقل کر دیتا۔

اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے اور مصنف کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

البیت المعمور فی عمارت القبور مولوی سعید علی نقی (صدر الافاضل) نے مسئلہ قباب و قبور اور آثار و مقابر کے متعلق اس رسالہ میں قرآن و حدیث سے استدلال کر کے ثابت کیا ہے کہ مجذوبوں کا موجودہ طرز عمل بالکل ناجائز ہے اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب موصوفی نے نہایت خوبی کے ساتھ منقولات سے اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے، لیکن یہ رسالہ زیادہ مکمل ہو جاتا اگر منقولات کے نقطہ نظر سے بھی بحث کی جاتی، کیونکہ میرے نزدیک بقا آثار (جس میں قباب و قبور یقیناً شامل ہیں) تمدنی اور سیاسی حیثیت سے بھی نہایت ضروری ہے اور مجذوبوں کا ہدم آثار و قباب ایسا نفوذ لایعنی فعل ہے جس کو کوئی مہذب انسان کبھی روا نہیں رکھ سکتا یہ رسالہ نور المطابع و کٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

آئین اردو یہ اردو قواعد کی کتاب ہے جس میں ہجا اور صرف و نحو سے نہایت بسیط گفتگو کی گئی ہے۔ میری رائے میں اس سے قبل کوئی کتاب اردو قواعد پر ایسی مبسوط و جامع نہیں لکھی گئی، وہ حضرات جو اردو زبان کا قواعد کی رو سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

ملک کو جناب فرجاد کوٹا نوی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک مفید کتاب کا اضافہ اردو زبان میں کیا ضخامت ۳۲ صفحات، طباعت وغیرہ بہت صاف قیمت ۴۰ پٹے کا پتہ: نامی بک ڈپو محلہ اندر کوٹ میرٹھ

مثنوی سنسکرت شاعری میں مثنوی سنگت نہایت مشہور و معروف چیز ہے، جناب اقبال درما صاحب سحر ہنگامی نے اس کا منظوم ترجمہ مثنوی سحر کے نام سے شائع کیا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ اصل سنسکرت زبان کا لطف ترجمہ میں کس حد تک آسکا ہے، لیکن میں انگریزی ترجمہ ضرور اس کا دیکھا ہے اور اسی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جناب سحر ترجمہ کرنے میں حقیقتاً بہت کامیاب ہوئے ہیں، مثنوی میں مباحثہ انداز بیان کے ساتھ جس قدر رنگینی کی ضرورت ہے وہ نہایت خوبی سے اس میں پیدا کی گئی ہے اور جناب درما کا یہ ادبی کارنامہ یقیناً قابل ستائش ہے یہ مثنوی ۸۰ میں دفتر زمانہ کانپور سے مل سکتی ہے۔

سید گل جناب سید اولاد حسین صاحب شاعر لکھنوی کا مجموعہ منظومات اس نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں بارہ نظمیں ہیں اور نہایت شگفتہ عنوانات پر لکھی گئی ہیں، نمود جمیع، زہرہ، برسات اور نور جہاں نہایت پاکیزہ نظمیں ہیں جن سے جناب شاعر کی ذہانت و قدرت نظر پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بعض نظموں میں قومی جذبات کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ایسی

منظومات کے لئے مخصوص جذبات حساست کی ضرورت ہے اور اس کا ہم لوگوں میں فقدان ہے اس لئے اگر ان میں کوئی بات نہ ہو تو شاعر کو معذور سمجھنا چاہیے۔ یہ مجموعہ ایک روپیہ میں جناب مصنف سے بریال لاٹریٹ ریمپور کے پتہ پر مل سکتا ہو۔

غذائے روح ترجمہ بھگوت گیتا کا ہے، جسے پنڈت پریمودیا مال صاحب مصر عاشق لکھنوی نے اردو نظم کی صورت میں پیش کیا ہے۔ گیتا ہندو مذہب کی نہایت مشہور و دقیق کتاب ہے، لیکن ترجمہ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جناب عاشق نے کس طرح آسانی سے اس کے مطالب کو نظم کر کے رکھ دیا۔ یہ کتاب ایک روپیہ میں مصنف سے پنج (چھاؤنی) کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

بچوں کی دیکھ بھال یہ مختصر سا رسالہ ہے جس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ تربیت اطفال کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے اور ملک جوں جوں بیدار ہوتا جائیگا اس کی اہمیت بڑھتی جائے گی اس لئے وہ حضرات جو اس موضوع پر لٹریچر فراہم کر رہے ہیں یقیناً قابل ستائش ہیں۔ میں نے اس رسالہ کو جستہ جستہ دیکھا اور بہت مفید پایا۔ ضرورت ہے کہ جو تو نگو اس کتاب کا مطالعہ کرایا جائے، تاکہ وہ پرورش و تربیت اطفال کے صحیح اصول سے واقف ہو سکیں، اس کتاب کی قیمت یہ ہے اور جناب اکبر حیدری سے اکبر مندرل دہلی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

مفید الاطفال فن تجوید کا مختصر سا رسالہ ہے جسے مولوی قاری محمد حسین صاحب مدرس مدرسہ بیت العلوم ہالی گاؤں ضلع ناسک نے مرتب کیا ہے۔ اگر کلام مجید کی تعلیم کے وقت بچوں کو یہ رسالہ بھی سمجھا کر پڑھا دیا جائے تو قرأت کی بعض مشکلات آسان ہو سکتی ہیں قیمت ۳/ مصنف کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

پلینٹ ادویات ڈاکٹر محمد حسین خان اقبال نے اس کتاب میں بعض نہایت مشہور پلینٹ دواؤں کے اجزاء مع وزن وغیرہ درج کر دیے ہیں، انگریزی میں ایک ضخیم کتاب پلینٹ ادویہ کے متعلق لکھی گئی ہے۔ غالباً اسی سے یہ اقبال صاحب نے اقتباس کر کے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ کتاب اس لحاظ سے نہایت اچھی ہے کہ بہت سے مجربات مغرب کا علم اس کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے لیکن میں اس کو مشکل بادور کر سکوں گا کہ صرف اجزاء اور ان کا وزن معلوم ہو جانے پر دوا ہی دیسی ہی رہو سکتی ہو جیسی ہمیں بازار سے ملتی ہے۔ قیمت دور روپیہ ہے، اور مولف سے ہال بازار امرت سر کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

دوشیزہ حصہ اول سردار موہن سنگھ صاحب دیوانہ ام۔ اے نے اپنی بعض نظموں کا مجموعہ اس نام سے شایع کیا ہے۔ اس ۳۲ صفحہ کے مختصر مجموعہ میں جو مجملہ شایع ہوا ہے جناب دیوانہ کی ۱۹ نظمیں نظر آتی ہیں، اور اس میں کلام نہیں کہ ان سب میں انھوں نے کوئی نہ کوئی جدت و ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ حضرت دیوانہ انگریزی زبان کے فاضل ہیں اس لئے قدرتا ان کی اردو نظموں میں مغربی انداز کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن اگر وہ بجائے اس تمام صنعت و آوروں کے، صرف مشرقی طریق اظہار کو اختیار کر کے آمد و مبیاختہ پن کی مثالیں پیش کرتے تو بہتر ہوتا۔ ان نظموں کے بعض اشعار حسن تخیل کے بہتر نمونے ہیں۔ دیکھیے اس دوشیزہ کا دوسرا حصہ کب تک سامنے آتا ہے۔ قیمت دور روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ڈاکٹر بن ہالی کرشن اگر وال دیرہ دون۔

معلومات

تاش کی تاریخ | تاش کا پہلے عموماً یورپ کی اختراع سمجھا جاتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ چارلس پنجم کی تفریح کے لئے ایک شخص گرنگورنے اسے ایجاد کیا تھا، لیکن یہ غلط ہے، کیونکہ عہد مسیح سے قبل ہندوستان و چین میں اس کا رواج پایا جاتا تھا اور ۷۰۰ برس قبل مسیح مصر میں اس کا رواج تھا۔

جب تیرہویں صدی عیسوی میں مغل حملہ آوروں نے جبسی (خانہ بدوش) جماعتوں کو ہندوستان سے نکالا تو ان کے ساتھ یہ کھیل بھی یورپ میں آیا۔

یورپ میں سب سے پہلے اس کا نام ٹروشی رکھا گیا جس کے ذریعہ سے علاوہ تفریح کے جبسی جماعتوں کے عادت کے موافق پیشین گوئی بھی کی جاتی تھی۔ ان تاشوں کی صورت ہندوستان کے تاشوں سے مختلف تھی، ہندوستان کے تاش (جن کو گنجفہ کہنا چاہیے) گول ہوتے تھے اور چین کے مستطیل۔ ان میں ۴۱ سے ۸۰ تک تپتے ہوئے تھے۔

اسپین والوں کو اس کھیل کا اس قدر خبط ہو گیا تھا کہ آخر کار ۱۵۸۳ء میں وہاں کے بادشاہ کو اس کی ممانعت کے احکام جاری کرنے پڑے۔ یہ کھیل اسپین سے اٹلی گیا اور یہاں سے جرمنی۔ جرمنی نے جو ہمیشہ تجارتی پہلو سے فائدہ اٹھاتا ہے، کثرت سے تاش بنانے شروع اور جن ممالک میں اس کا رواج تھا وہاں اتنی برآمد کی کہ آخر کار لوگوں کو جرمنی کی اس خطرناک تجارت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی پڑی۔

جرمنی سے فرانس نے اس کھیل کو چھل کیا، اور پیران پر امراء دربار اور شاہانِ دقت اور بیگمات کی تصویر بنانے کا رواج ہوا، بعد کو محض تفریح اس کا مقصد نہ رہا بلکہ قمار بازی کا ذریعہ بھی اس کو قرار دیا گیا چنانچہ ہنری ہفتم اس کا بڑا شائق تھا اور اس کی مٹی مارگرٹ کا بھی یہی حال تھا۔

اہلِ کلیسہ نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن چونکہ یہ مخالفت صرف زبانی تھی (کیونکہ یہ لوگ خود چھپ کر کھیلتے تھے) اس لئے زیادہ اثر نہ ہوا تاہم اس میں کچھ اضمحلال ضرور پیدا ہوا، لیکن بعد کو جب حکومتِ کلیسہ کا وار ختم ہو کر شاہنشاہی کا دور آیا تو پھر اسی کو ترقی ہوئی، یہاں تک کہ چارلس ثانی رات دن اس میں مصروف رہ کر قمار بازی کیا کرتا تھا۔

اب اس کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ ولایت میں گزشتہ سال پچاس لاکھ تاش فروخت ہوئے۔ اور لاکھوں پونڈ کا فائدہ تاش بنانیوالوں کو ہوا۔ **بندر اور موسیقی** | پیرس میں ایک تعمیر ہے جس کا نام فارمیتیر ہے، اس میں آلات موسیقی پر کام کرنیوالے سب کے سب بجائے انسانوں کے بند رہیں اور آرگسٹری یعنی موسیقی کی چوکی انھیں کے سپرد ہے۔ ان باجہ بجا نیوالے بندروں کا ایک سردار بھی ہے جو فن موسیقی کا زیادہ ماہر ہے اور ایک مینیڈاٹر کی طرح اپنے تمام ماتحت بندروں سے باجے بجاتا ہے روزانہ لوگ اس تعمیر میں

سراحت

نشاہی تین روپیہ

جاتے ہیں اور بندروں کے اس ذہانت پر حیرت کرتے ہیں۔
 دنیا کی سب سے چھوٹی آبادی آرمینیا میں کوہ اراراط کی چوٹی پر کسی وقت ایک نہایت مشہور تاریخی شہر آباد تھا جس کا بارہ شنگ

صدی عیسوی سے لیکر دسویں صدی تک خلفاء بغداد کا قبضہ اس پر رہا تھا۔ ۶۰۰ سال سے یہ بالکل ویران ہو گیا ہے۔
 امریکہ کی ایک جماعت شرق ادنیٰ کے سیاحت کے سلسلہ میں جب یہاں پہنچی تو اس کو نہایت تعجب ہوا، کہ یہ مقام اب بھی آباد۔
 آبادی مشمل ہے صرف ایک راہب، ایک بلی اور ایک الو پر۔ بلی اس راہب کی رفیق ہے جسے وہ انقرہ سے لایا تھا، اور بوم کلیں مار
 میں رہتا ہے۔ اسی سمار شدہ کلیہ کے ایک حجرے میں راہب اپنی زندگی خدا جانے کب سے بسر کر رہا ہے۔

سفر میں یورپ کے ملکوں میں جس قدر مسلمان آباد ہیں، ان کا اندازہ وہاں کے ایک رسالے
 اس طرح کیا ہے۔

یورپ میں
مسلمانوں کی آبادی

۲۹	بلغاریہ =	۲۴۲۵۰۰	۸۳۰۰۰۰	البانیہ =
۳۱	جبل اسود =	۱۰۵۰۰۰	۴۷۵۰۰۰	یونان =
۳۳	روس =	۱۵۲۰۰۰۰۰	۴۴۰۴۷	رومانیہ =
۳۴	مجموعہ =	۱۷۷۸۸۹۵۷	۴۶۲۳۷۰	باقی حصہ یورپ =

نیویارک میں ہر تین منٹ میں ایک شخص گرفتار ہوتا ہے۔ ہر تیرہ منٹ میں ایک بکھل ہوتا ہے۔ ہر سات منٹ میں ایک
 کیا جاتا ہے، ہر ڈیڑھ گھنٹے میں ایک شخص کسی حادثہ سے مرتا ہے، ہر ۴۸ گھنٹے میں ایک قتل ہوتا ہے۔
 گھنٹے میں ایک خودکشی ہوتی ہے۔

چین کے قید خانے غالباً یہ خبر حیرت کے ساتھ سُنی جائے گی کہ چین کے قید خانے دنیا کے بہترین قید خانوں
 ہیں۔ یہاں بکلی کی روشنی ہوتی ہے، قیدیوں کو زندگی کے تمام اسباب راحت مہیا

لا بُریری ہوتی ہے جہاں قیدی آزادی کے ساتھ کتابیں اخبار و رسائل دیکھ سکتے ہیں۔ ایک وسیع میدان ہوتا ہے جہاں
 کودنے کے مختلف مشاغل میں حصہ لے سکتے ہیں اور چوبیس گھنٹوں میں کھڑا اس وقت محنت شاقہ کے لئے بھی دینا پڑتا ہے۔
 پتھر کوٹتے، کان، آٹا پیستے ہیں یا اور اسی طرح کا کوئی سخت کام انجام دیتے ہیں۔

فرانس کا تعیش حال ہی میں موسیو دانیال جیدری کی صدارت میں ماہرین بادہ خواری کا ایک عجیب و غریب
 بڑے بڑے ماہر شراب پینے والے جمع ہوئے اور ہر ایک کے سامنے آٹھ گلاس مختلف قسم کے

بہر کر رکھے گئے۔ اس کے بعد ان کو اجازت دی گئی کہ وہ ہر گلاس کی شراب چکھ کر بتائیں کہ اس شراب کا کیا نام پیدا ہو گئی تو نگار
 نے جاری کیا۔ ہر چہ
 حیرت کی انتہا نہ رہی

امریکہ میں اس وقت عورتیں مختلف مشاغل میں مصروف نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہاں کے ایک اخبار نے ظاہر کیا ہے کہ اس وقت اتنی لاکھ سے زیادہ عورتیں اپنے قوت بازو سے معاش حاصل کرتی ہیں۔ ان میں ۶۱۷۵۰۰ عورتیں ٹیلیفون ۷۲۶۷۰ گاتی بجاتی ہیں، ۶۳۵۲۰ معلمین، ۷۲۸۶۵ نرسی ہیں، ۴۳۵۷۰۰ حساب کتاب کا کام کرتی ہیں ۴۴۷۰۰۰ ۵۶۴۷۰۰ کتابت انجام دیتی ہیں اور ۷۲۱۶۳۰ کلرک ہیں۔

سیاحت فرانس میں
رواج پایا جاتا ہے کہ روزمرہ تک کا صرف

سرکاری طریقہ پر جو اعداد شمار فراہم کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت کنندگان امریکہ اور دیگر ممالک نے دوران سیاحت میں فرانس کے اندر پچاس کروڑ فرانک صرف کئے۔

یورپ کے گروں کا اجارہ
انگلستان میں اخبارات و رسائل کی اشاعت اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ پبلک کا ہر طبقہ اپنے انفرادی مقاصد کے لئے متعدد اخبار اور رسالے شایع کرتا ہے۔ حال ہی میں فقروں اور گداگروں نے بھی ایک اخبار نکالا۔ ان تاشو اس کے مضامین زیادہ تر فقر و افلاس سے متعلق ہوتے ہیں اور خبریں بھی اس میں اکثر اسی قسم کی شایع ہوتی ہیں۔ مثلاً یہاں اور چین کے مسائل ہوٹل میں مقیم ہے۔ اس کی آمدنی معقول ہے۔ اخلاق اچھے ہیں، سخا و کرم کا عادی ہے۔

اپنی والوں کی تبلیغ
لندن کا ایک بڑا پوری ہوائی جہاز میں ٹھیکر کرہ زمین کے گرد طواف کرنے کے لئے نکلا ہے، وہ لندن سے کناڈا اور کناڈا سے نیوزیلینڈ گیا ہے اور وہاں سے اسٹریلیا اور دوسرے شرقی ممالک میں ہوتا ہوا انگلستان پہنچے گا۔ سفر شروع کرتے وقت اس نے ظاہر کیا ہے کہ میں دین مسیح کی تبلیغ کے لئے نکلا ہوں۔

بلند کرنی پڑی گوشت
یورپ کے بعض کمیٹ اس کوشش میں ہیں کہ بولے اور چند دیگر اشیاء سے مصنوعی گوشت تیار کریں، جو بلا تکلف طبیعی گوشت کی جگہ استعمال ہو سکے، اگر اس میں کامیاب ہو گئی اور یہ گوشت ہندوستان میں تفریح اس کا مقصد دہن کی وہ جماعتیں بھی اس کو بلا تکلف کر لیں گی جن کے مذہب میں گوشت مطلقاً حرام ہے۔ یہی حال تھا۔

ایک غلطی کی تصحیح

دسمبر کے رسالہ میں صفحہ ۵۹ پر جناب وصل بلگرامی کی نظم "حسن خوابیدہ" میں تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ یوں چھپ گیا ہے۔
خبر لا اس عالم میں کون و مکاں کی
علائکہ اسے یوں چھپنا چاہیئے تھا۔

ناظرین درست فرمائیں

خبر لا اسی طرح کون و مکاں کی

اہل کلیہ نے اس کی سزا
تاہم اس میں کچھ اضافہ
کہ چارلس ثانی راز
اب اس کی ترقی کا
بندر اور موسیقی
ہے جو فن موسیقی

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے